ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

رشید امجد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

رشید امجد

حرف اکادمی
1-103A پشاور روڈ، راولپنڈی
فون: 5566131

جملہ حقوق محفوظ

اہتمام : کرنل (ر) سید مقبول حسین (ستارۂ امتیاز)

کتاب : ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

مصنف : رشید امجد

سرورق : ریاظ

اشاعت : جنوری 2002

تعداد : پانچ سو

پریس : اسد محمود پرنٹنگ پریس، گوالمنڈی، راولپنڈی

قیمت : 80 روپے

ناشر : **حرف اکادمی**

103/A-1، پشاور روڈ، راولپنڈی

فون 5566131

احسن کے نام

ترتیب

☆ ☆ ☆

وقت اندھا نہیں ہوتا

نیم تاریک' سنسان گلی دور تک خالی' گلی میں کوئی درخت نہیں لیکن ہر وقت گھنی چھاؤں کا سا احساس ہوتا' نیم پکے' نیم کچے فرش پر قدموں کی چاپ بیٹھی بیٹھی سی لگتی' نیم بوسیدہ دروازے بند' جن کے اندر چھپی ان دیکھی دنیائیں' ان کے مکین گم آوازوں کے حصار میں دور کہیں سائے سے' چلتے چلتے' ٹھٹکتے ٹھٹکتے آگے جا کر اسی طرح کا ایک نیم بوسیدہ گم سم سا دروازہ' کبھی دور سے آنکھیں مارتا تھا' لیکن اب دیمک کی زد میں بوند بوند مٹی ہوا جا رہا تھا' زمانوں کے زنگار میں لتھڑا' حیران حیران سا' چپ چپ سا۔

دستک ----- دستک کے بہت دیر بعد اندر ایک پراسرار چاپ' پھر دروازے کا تھوڑا سا حصہ تھکی چرچراہٹ کے ساتھ نیم وا ہوا' ایک ستی ہوئی اکتائی آواز ---- "کون؟"

"جی ------- میں"

"میں کون؟" ستی ہوئی' اکتائی آواز میں ایک بے دلی کا عنصر بھی نمایاں ہوا۔

"جی میں" یادوں کا ایک ہجوم بھنور سا بن گیا۔

"تم" ایک خوشگوار حیرت خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا اور کھل گیا۔

"آؤ نا"

اندر آتے ہوئے میں نے اس تھکے وجود پر ایک نظر ڈالی۔ میلے بغیر استری کپڑوں میں ایک تڑخا ہوا ڈھانچہ۔ تھکے قدموں سے وہ آگے آگے' میں پیچھے پیچھے۔

کئی برس پہلے جب دروازہ کی چوکھٹ میں بوسیدگی نہیں آئی تھی' آسمانی رنگ کے کلف لگے جوڑے میں' نپے تلے قدم اٹھاتی وہ آگے آگے اور میں نیم

بوکھلایا پیچھے پیچھے۔ نفیس پردوں سے سجے کمرے میں نرم گداز صوفے میں بیٹھتے یوں لگا جیسے کسی نے میرے گرد ریشم بن دیا ہے۔ گاؤں کی کھری چارپائی سے ہوسٹل کے کمرے میں فرش پر پڑے گدے تک ہر طرف کھردرا پن ہی کھردراپن تھا۔ ہوسٹل کے کمرے میں جگہ جگہ سے پھٹی میلی دری پر روئی سے تقریباً خالی گدا' ایک نیم گرم چادر' پرانی کرسی اور پینگ کی طرح ڈولتا میز میری کل کائنات تھا۔

"تو ہوسٹل میں ٹھہرے ہو"

"جی-----------جی"

"کوئی تکلیف تو نہیں"

"جی نہیں"

"چائے پیو گے"

"جی نہیں"

وہ مسکرائی اور اس کے سفید دانتوں کا لشکارا دور تک میرے اندر اتر گیا----"تو تمہیں صرف دو ہی لفظ آتے ہیں"

"جی نہیں" میں ہڑبڑا گیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دوسرے کمرے کی طرف منہ کرکے آواز دی----"اماں چائے لے آؤ"

کمرے کی ویرانی اور اس کی ویرانی میں زیادہ فرق نہ تھا۔ صوفے کا کپڑا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میں ایک کونے میں سمٹ گیا۔

"کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی" وہ مسکرائی اور اس کے میلے دانت سارے چہرے پر پھیل گئے' مجھے گھن سی آئی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں"

اس نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی----"پیتے ہو یا چھوڑ دیئے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اٹھالیا۔ اس نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ماچس میری طرف پھینک دی----"بس عادت ہی پڑ گئی ہے۔ بیٹھو میں چائے لے کر

آتی ہوں۔"

وہ اٹھی تو لگا ساری عمارت جگہ جگہ سے تڑخ گئی ہے۔ وقت نے اس کے چہرے پر جو جالے بنے تھے ان میں کرختگی در آئی تھی۔ میرے ذہن میں اس کا برسوں پرانا پیکر گھوم گیا۔ چائے بناتے ہوئے اس کی انگلیاں تھرک رہی تھیں۔ بسکٹوں کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے میری انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہوئیں تو لگا سارے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا ہے۔

"تو دو سال یہاں رہو گے۔"

میں نے سر ہلا دیا۔

"آجایا کرو----- جب جی چاہے۔"

واپسی پر اس کی خوشبو ہوسٹل تک میرے ساتھ ساتھ آئی اور کئی دنوں تک میرے وجود میں سرسراتی رہی۔

اگلے ہفتے ڈرتے 'ڈرتے منقش دروازے پر دستک دی۔ نوکرانی نے جھانک کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتی' ڈیوڑھی میں گھنٹیاں بج اٹھیں----- "اماں کون ہے۔"

نوکرانی سے پہلے ہی میں بول بڑا----- "جی میں ہوں"

"اندر آؤنا----- باہر کیوں کھڑے ہو؟"

اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں جاتے یوں لگا جیسے میں ریشم میں سرسراتی کسی روح کے ساتھ چل رہا ہوں۔

چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا----- "اس دن پوچھنا بھول ہی گئی' کس مضمون میں داخلہ لیا ہے۔

"فلاسفی" میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"واہ" وہ اچھل پڑی----- "یہ تو میرا پسندیدہ مضمون ہے' بھئی تم سے میل ملاقات رہنا چاہئے۔"

سرسراتے ریشمی لباس میں اس کا سراپا باہر نکلنے کے لئے تڑپ تڑپ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور میرے سارے وجود میں کوئی نامعلوم سی لہر

دائیں بائیں، اوپر نیچے دوڑ گئی۔

"فلاسفی بڑا دلچسپ مضمون ہے، مزہ آتا ہے پڑھنے میں" وہ چپ سی ہو گئی۔ پھر قدرے اداس سے لہجے میں بولی "میں نے بی اے تک ہی پڑھی ہے۔"

وہ چپ ہو گئی، بہت دیر چپ رہی۔ میں اس دوران ناخنوں سے پوروں کو ٹٹولتا رہا۔

"پڑھنا تو چاہتی تھی----- شوق بھی تھا پر" ----- اس کے لہجے میں اداسی گھمبیر ہو گئی----- "اماں کی موت نے سب اتھل پتھل کر دیا، اگلے دو تین برسوں میں دونوں بھائی بھی جان چھڑا کر باہر نکل گئے۔"

"تو اب آپ بالکل اکیلی ہیں" میں نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"اکیلی کہاں----- یہ بی اماں جو ہیں" اس نے بوڑھی نوکرانی کی طرف اشارہ کیا، جو ٹرالی لئے باہر نکل رہی تھی۔

"جی----- جی" میں نے ہونقوں کی طرح سر ہلایا۔

وہ ہنس پڑی----- "تمہاری اس جی میں بڑا مزہ ہے۔"

"جی-----"

وہ کھلکھلائی----- "اب آؤ تو فلاسفی کی کوئی نئی کتاب لیتے آنا"----- وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

اس رات ریشم میں سرسراتا، ابھرتا ڈوبتا، اس کا جسم مجھے الٹ پلٹ کرتا رہا۔ سارا ہفتہ اس کے جسم کو چھونے کی خواہش نے بے چین کئے رکھا۔ ہفتہ بعد فلاسفی کی کتاب دیتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں سے انگلیاں مس کیں۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر کتاب میز پر رکھدی----- "شکریہ----- تم نے یاد رکھا۔"

میں نے کہا----- "میں تو لمحہ بھر کے لئے نہیں بھولا، بس ہفتہ کا دن آتا ہی نہیں تھا۔" اس نے گھنی پلکیں اٹھائیں، میں اندازہ نہیں کر سکا یہ حیرت تھی خوشی یا سحر----- "ہفتہ ہی کیوں، کسی دن بھی آجاتے۔"

"اچھا" میرے اندر بانسری بجنے لگی----- "کسی دن بھی، آپ مصروف تو

نہیں ہوتیں۔"

"میں-----" وہ ہنسی-----"میں تو شکر کرتی ہوں کوئی آئے۔"

"تو بس-----" میں جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"اب آؤ تو ذرا وقت پر آنا-----کھانا اکٹھے کھائیں گے۔"

پھر دنوں کی تقسیم ختم ہو گئی' ہفتہ سے تین اور پھر تقریباً روزانہ' لیکن لمبی چوڑی بحثوں اور گھنٹوں کی قربت بھی مجھے آپ سے تم پر نہ لا سکتی۔ اس کے رنگ برنگے لباس' آرائش اور سر سراتا' اٹھکیلیاں کرتا سراپا' میرے سارے وجود پر چھا گیا۔ خوابوں میں' میں اس سے لپٹ لپٹ جاتا' لیکن جاگتے میں فاصلے اسی طرح رہتے' بس ہو سکا تو اتنا کہ کبھی کوئی کتاب لیتے دیتے' کبھی کوئی پلیٹ پکڑتے پکڑاتے اس کے ہاتھوں کے لمس کا ذائقہ محسوس ہو جاتا' یا کبھی دروازے میں سے نکلتے اس کے کندھے سے کندھا چھو جاتا' یہ ذائقہ یہ لمس کئی کئی دن مسحور کیے رکھتا۔

انہی سوتی جاگتی کیفیتوں' خوابوں اور لمس کی لذتوں میں دن پر لگا کر اڑ گئے۔ امتحان قریب آ گئے۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر ہمت نہ پڑتی۔ کوئی بات زبان تک آتے آتے رک سی جاتی۔ ریہرسلیں کر کے' جملے دہرا دہرا کے' رٹ رٹ کے' سامنا ہوتا تو سب گڈمڈ ہو جاتا۔ اک نامعلوم سی جھجک ان دیکھے پردے کی طرح درمیان میں حائل ہو جاتی۔

شائد امتحان شروع ہونے سے دو تین دن پہلے کی بات ہے' میں کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ گھبراہٹ میں کبھی صوفے کے ایک طرف ہوتا کبھی دوسری طرف۔ وہ کن انکھیوں سے مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھی' کہنے لگی-----"پریشان ہو"

میں نے اٹکے اٹکے لہجے میں کہا-----"اک بات ہے۔"

"کہو"

میں چپ رہا' کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

بولی-----"کہو نا"

میرے ضبط کا کنارہ ٹوٹ گیا۔ بڑے ہی بے ڈھنگے طریقے سے نیم بند آنکھوں کے ساتھ' معلوم نہیں لفظ کیسے ادا ہوئے-----"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا

ہوں۔"

وہ چپ رہی، بہت دیر چپ رہی، پھر دھیمی آواز میں بولی ---- "تمہیں اپنی میری عمروں کا فرق معلوم ہے۔"

میں نے کہا ---- "عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔"

بولی ---- "بہت کچھ ہوتا ہے، محبت اندھی ہوتی ہے، وقت اندھا نہیں ہوتا" میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھدیا، پھر دفعتہ مجھے شانوں سے پکڑ کر میرا منہ سامنے کیا ---- دیکھتی رہی کچھ دیر دیکھتی رہی پھر بولی ---- "پریشان نہ ہو، جاؤ جاکر تیاری کرو، تمہارے مستقبل کا انحصار اس امتحان پر ہے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھدی اور ---- پھر دفعتہ" جھک کر میرے ماتھے پر اپنے ہونٹ ثبت کردیئے۔

وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تو میں نے دیکھا اس کے آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے ہیں۔ وقت ٹھہرگیا ---- ٹھہرا ہی رہا۔ امتحان کے عرصہ میں بھی اس کے نرم گذار، گرم رسیلے ہونٹ میرے ماتھے پر ثبت رہے۔

آخری پیپر دے کر میں اس کی طرف آیا۔ دو تین بار کی دستک کے جواب میں بوڑھی نوکرانی نے ذرا سا دروازہ کھولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولی -- "باجی کراچی گئی ہیں، ان کی خالہ بیمار ہیں، پانچ چھ مہینے رہیں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا۔ دروازہ بند ہوگیا۔

میں کچھ دیر کھڑا رہا، پھر بوجھل قدموں سے واپس پلٹا، جانے کیوں احساس ہو رہا تھا کہ بند دروزاے کے پیچھے ستاروں بھری دو آنکھیں مجھے دیکھے جارہی ہیں، زمانے بیت گئے ---- بیت گئے۔

اور اب برسوں بعد ---- کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی ---- "اماں بازار گئی ہے۔"

جھریوں بھرے کانپتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے میں نے ان نرم

گداز ہاتھوں کے لمس کو محسوس کرنے کی ایک ناکام سی کوشش کی، جن کا تصور کبھی مجھے ہفتوں بیخود کئے رہتا تھا۔

"عرصہ بعد دیکھا ہے تمہیں۔"

میں نے کہا۔۔۔۔ "ایک میٹنگ میں آیا تھا۔"

"رہو گے" اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ کھنکتا لہجہ اور ترنم اب بھولے بسرے زمانوں کی یاد تھا۔

"نہیں آج شام ہی لوٹ جاؤں گا۔"

وہ چپ رہی، میں بھی چپ رہا۔۔۔۔ خاموشی گہری اور گہری ہو گئی۔

شاید زمانے بیت گئے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ "چلتا ہوں"

وہ بھی کھڑی ہو گئی، کچھ نہ بولی۔

آگے پیچھے ہم ڈیوڑھی میں پہنچے۔ لحہ بھر کے لئے رک کر میں نے اسے دیکھا، پھر دروازہ کھولنے لگا۔ میرا ایک پاؤں دہلیز کے اندر اور دوسرا باہر تھا کہ دفعتہ" وہ آگے جھکی، شانوں سے پکڑ کر میرا منہ اپنی طرف کیا اور سوکھے ٹھنڈے ہونٹ میرے ماتھے پر رکھ دئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے مڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

میں چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا، پھر آہستہ سے دروازہ بند کرکے گلی میں نکل آیا۔

نیم تاریک، سنسان گلی دور تک خالی، گلی میں کوئی درخت نہیں، لیکن ہر وقت گھنی چھاؤں کا سا احساس، نیم پکے، کچے فرش پر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے میں نے سوچا۔۔۔۔ "کیا واقعی وقت اندھا نہیں ہوتا؟"

ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

ناشتہ کرتے ہوئے اچانک ہی خیال آیا کہ پچھلے ٹیرس پر پڑی چارپائی کو بنوانا چاہئے۔ محلے والے گھر سے اس نئے گھر میں منتقل ہوتے ہوئے اپنا بہت سا پرانا سامان وہیں بانٹ بونٹ آئے تھے' بس یہ ایک چارپائی کسی طرح ساتھ آ گئی۔ کچھ عرصہ پچھلے ٹیرس پر دھوپ میں بیٹھنے کے کام آئی' پھر زندگی کی مصروفیات بڑھیں تو دھوپ میں بیٹھنا بھی کبھی کبھار ہو گیا۔ چارپائی نواڑ کی بنی ہوئی تھی' بارشوں اور دھوپوں میں نواڑ گل گئی۔ جگہ جگہ سے گل کر نواڑ کی پٹیاں لٹکنے لگیں' ایک دن اس کے بڑے بیٹے نے نواڑ کھول کر چارپائی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا' پھر برسوں وہ اسی طرح پڑی رہی۔ کبھی کبھی کوئی پچھلے ٹیرس کی طرف جاتا تو خیال آتا کہ اب کوئی پرانی چیزیں لینے آیا تو اسے بیچ دیں گے' پھر بات بھول بھال جاتی' کسی کو خیال نہ آتا کہ اسے بنوا لیا جائے۔ اس کا کوئی استعمال ہی نہ تھا۔ ہر کمرے میں نئی طرز کے بیڈ تھے اور چارپائی رکھنے کی کہیں جگہ بھی نہ تھی' لیکن اس صبح ناشتہ کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ چارپائی بنوا لینی چاہئے' سردیاں آ رہی ہیں۔ دھوپ میں بیٹھنے کے کام آئے گی۔ زیادہ نہ سہی چھٹی والے دن تو بیٹھ ہی سکتے ہیں۔ دھوپ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا کتنا مزہ ہے۔ پرانے گھر میں وہ اکثر چھت پر ہی کھانا کھاتے۔ سردیوں میں تو یہ معمول تھا' لیکن اب تو ڈائنگ روم تھا۔ میز کرسیاں تھیں مگر دھوپ میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن بیوی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ حسب معمول پیچھے پڑ جاتی کہ اس بلاوجہ خرچے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں خرچے اور بلاضرورت اور ضرورت کا ذکر تو چلتا ہی رہتا تھا۔ بس گزارہ چل رہا تھا۔ وہ کہتا--- یہی کیا کم ہے کہ عزت سے گزر ہو رہی ہے۔ لیکن بیوی کو ابھی کئی چیزیں بنوانی تھیں' کہیں پردے بدلوانا تھے' کہیں بیڈ

ٹیٹیں لانا تھیں، پھر بچوں کے آئے دن کے تقاضے یہ وہ، یہ وہ--- اس پرانی چارپائی کو بنوانا کسی حساب میں نہ آتا تھا، پورے گھر میں کوئی بھی اس کی تائید نہ کرتا اس لئے اس نے سوچا کہ جب تک سامان نہ آ جائے اور بننے والا نہ آ جائے کسی سے اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔ پرانے محلے میں تو چارپائی بننے والے دوسرے تیسرے دن گلی میں آواز لگاتے گزرتے تھے، لیکن ان نئی آبادیوں میں چارپائی کہاں تھی کہ بننے والے ادھر کا رخ کرتے، اس کے لئے شہر جانا پڑتا تھا، اس نے سوچا دفتر سے فارغ ہو کر شہر کا چکر لگا آئے گا اور کسی بننے والے کو ساتھ لے آئے گا۔

دفتر سے نکل کر وہ پرانے شہر کی طرف آ گیا۔ اب نواڑ کا تو زمانہ نہیں رہا۔ پلاسٹک کی رنگ برنگی رسیوں سے بنی چارپائی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس طرح کی کئی دکانیں سیڑھیوں والے پل کے پاس تھیں۔ وہاں پہنچا تو دکانوں کے باہر رنگ برنگی رسیوں سے بنی چارپائیاں اسے بڑی ہی بھلی لگیں۔ پہلی ہی دکان سے کورا جواب مل گیا۔ دکاندار نے کہا۔ "رسی تو مل جائے گی لیکن بننے والا نہیں۔"

اس نے کہا--- "میں بننے والے کو ساتھ لے جاؤں گا اور گاڑی میں واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

دکاندار نے نفی میں سر ہلایا--- "اب یہ کام کرنے والے کم ہیں۔ یہ چند لوگ بمشکل دکانوں کی ڈیمانڈ ہی پوری کرپاتے ہیں۔ آپ کو بننے والا مشکل ہی سے ملے گا۔"

دوسری تیسری اور چوتھی دکان سے بھی یہی جواب ملا۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا اس کے ذہن میں ٹیرس پر پڑی رنگ برنگی چارپائی کا تصور دھندلا سا گیا۔ "تو کوئی صورت نہیں۔" اس نے آخری دکاندار سے پوچھا۔

"شاید بنی والے چوک میں کوئی مل جائے--- میرا خیال ہے مل جائے گا، وہاں بڑی مارکیٹ ہے۔" دکاندار نے کہا۔

اس رش والے وقت میں شہر کے اس حصے میں جانا آسان کام نہیں تھا، لیکن وہ چل پڑا۔ تنگ بازاروں سے چیونٹی کی طرح رینگتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے عجب طرح کا سرور آیا۔

زندگی تو یہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ لبالب بھری ہوئی۔

اسے خیال آیا کہ چند برس پہلے جب وہ بھی اندرون شہر رہتا تھا تو اس کی زندگی بھی اسی طرح لبالب بھری ہوئی تھی' ہر وقت ایک ہنگامہ' ایک شور' ڈھیر سارے لوگوں کے درمیان' اپنائیت کے گرم لمس کے ساتھ اور اب اس نئی آبادی میں سکون ہی سکون تھا خاموشی' اپنے کام سے کام۔ معیار بڑھ گیا تھا لیکن جیسے زمین سے نکل کر گملے میں آ گئے تھے' لیکن یہ تو صرف اس کا احساس تھا۔ بیوی بچے تو خوش تھے کبھی اندرون شہر کا ذکر آتا تو ان کی بھنوئیں سکڑ جاتیں' مگر وہ کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے ادھر نکل ہی آتا۔ اس وقت بھی بھوک کی شدت کے باوجود اسے رینگ رینگ کر چلنے میں مزہ آ رہا تھا۔

ادھر والی مارکیٹ بڑی تھی' اس نے گاڑی مشکل سے ایک جگہ کھڑی کی۔ پہلی دو تین دکانوں سے وہی مایوس جواب ملا۔ "چارپائی یہاں لے آئیں۔"

یہ تو ممکن نہیں۔ اس نے سوچا---- ایک طرف سے ہی سوزکی والا دو سو سے کم نہیں لے گا---- چار سو تو کرایہ ہی ہو گیا۔

اس کا دل بیٹھ سا گیا---- تو چارپائی نہیں بن جا سکتی۔

پچھلے ٹیرس پر چہچہاتا پرندہ چشم زدن میں اڑ گیا۔ وہی اداس ٹیرس اور کونے میں دیوار سے لگا چارپائی کا فریم۔

"تو واپس چلوں" اس نے اپنے آپ سے کہا---- "خوامخواہ بھوک بھی کاٹی۔"

"جناب اندر آئیں نا' میرے پاس بڑی ورائٹی ہے۔" وہ جس دکان کے باہر کھڑا تھا' اس کے اندر سے آواز آئی۔

وہ اندر چلا گیا۔ دکاندار بڑا خوش اخلاق تھا۔ کہنے لگا---- "پسند کریں نا میرے ریٹ بڑے مناسب ہیں۔"

"مجھے خریدنا نہیں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "چارپائی بنوانا ہے۔"

"بنوانی ہے---- کہاں؟"

"ہے تو ذرا دور پر میں بندے کو ساتھ لے جاؤں گا اور واپس چھوڑ دوں

گا۔" پھر جلدی سے بولا ---- "سارا سامان تو آپ سے لینا ہے بس بندہ۔"

دکاندار نے ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا' پھر بولا۔ "بندہ تو آج کل مشکل ہی ملتا ہے' لیکن آپ ذرا بیٹھیں میں پتہ کرتا ہوں۔"

رنگ برنگا پرندہ آسمان کی وسعتوں سے چکرا کر پھر پچھلے ٹیرس پر آ بیٹھا۔ دکاندار اسے بٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے آنے تک وہ امید و ناامیدی کے بھنور میں ابھرتا ڈوبتا رہا۔

"بندہ تو اس وقت موجود نہیں' ہاں صبح مل جائے گا' لیکن آپ کو صبح چھ بجے آکر اسے لے جانا ہو گا' ورنہ اس نے کسی کا کام شروع کر دیا تو ----" دکاندار نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"میں آ جاؤں گا ---- آ جاؤں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "صبح تو اتوار ہے چھٹی ہے۔ میں چھ بجے آ جاؤں گا۔"

دکاندار نے کہا --- "تو سامان آپ ابھی لے جائیں۔ دکان تو صبح دیر سے کھلے گی لیکن بندہ یہاں موجود ہو گا۔"

رسیوں کے گچھے گاڑی میں رکھتے ہوئے اسے خیال آیا اگر صبح بندہ نہ ملا تو یہ ساڑھے چار سو روپے تو ضائع ہو جائیں گے' اس نے دکاندار سے کہا --- "دیکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح -----"

دکاندار نے اس کی بات کاٹ دی ---- "بندہ موجود ہو گا جی' لیکن چھ بجے کے بعد کی ذمہ داری نہیں۔"

پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے بیوی کی نظر پچھلی سیٹ پر پڑی گچھوں کی طرف گئی۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ گڑبڑا گیا ---- کم از کم کھانا تو کھا لیتا' پھر آرام سے موقع دیکھ کر بات کرتا' لیکن گیٹ کھولنے بیوی خود نکل آئی تھی۔

"یہ -----" اس نے تھوک سے حلق تر کیا ---- "یہ ---- میں نے سوچا وہ اوپر ---- وہ اوپر ٹیرس پر' پچھلے ٹیرس پر چارپائی پڑی ہے نا' اسے بنوا لیا

جائے۔"

کیا----" وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی---"وہ پرانی چارپائی' کس لئے---اور یہ سامان کتنے کا آیا ہے؟"

"بس زیادہ نہیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا---"زیادہ نہیں۔ تین چار سو کا۔"

"تین چار سو کا۔" وہ پھر چیخی۔

"ساڑھے چار سو کا۔" اس کے منہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔

"ساڑھے چار سو----" اس کی چیخ اور بلند ہو گئی---"اور بنوائی؟"

"دو سو----دو سو۔"

اس کی بیوی نے ماتھے پر ہاتھ مارا---"تمہاری عقل تو کام کرتی ہے نا---ساڑھے چار سو ایک بیکار چارپائی کے لئے۔"

وہ اندر بھاگ گیا۔

"ہم یہاں بھوک سے مر رہے ہیں اور یہ صاحب بہادر یہ رسیاں خریدتے پھر رہے ہیں' میں پریشان ہو رہی تھی کہ اب تک کیوں نہیں آئے اور یہ----"

اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس بس۔" وہ غصے سے بولی۔ "مجھ سے اب بات بھی نہ کرنا۔"

کھانا کھاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھو میری بات تو سنو۔"

"کیا سنوں----" اس کا غصہ اترنے ہی میں نہ آتا تھا---"تمہاری کوئی ترجیح ہی نہیں' میں کہتی ہوں ہم نے اس چارپائی کا کرنا کیا ہے؟"

"سردیاں آ رہی ہیں' دھوپ میں بیٹھنے-----"

"کون بیٹھتا ہے دھوپ میں' وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟" اس نے اس کی بات کاٹ دی---"میں پوچھتی ہوں ہم نے کرنا کیا ہے اب چارپائی کا رکھنے کی جگہ نہیں۔"

"میرا کیلکولیٹر گم ہو گیا ہے' اسے لینے کے لئے تو پیسے نہیں اور ساڑھے چار سو چارپائی پر خرچ کر دیئے ہیں۔" بڑے بیٹے نے ناگواری سے کہا۔

"تم لوگ چپ رہو۔" اس نے ڈانٹا۔

"چپ کیوں رہیں؟" بیوی کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "گھر کے لئے تو تمہارے پاس پیسے نہیں ہوتے اور ان فضول کاموں کے لئے---- میں کہتی ہوں سامان واپس کر دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ دکاندار سے کہو کم پیسے دے دے۔ تم نہیں کر سکتے تو میں ساتھ چلتی ہوں۔ میں بات کر لوں گی۔"

"نہیں----- نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے اب مجھ سے بات نہ کرنا۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ دونوں بیٹے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ وہ وہیں اکیلا بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

کچھ غلط ہی ہو گیا ہے۔ اس نے سوچا------ واقعی کیا ضرورت تھی۔ ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہے' خوامخواہ چھ سات سو روپے----- پانچ سو کا کیلکولیٹر ہی لے دیتا بیٹے کو---- روز کہتا ہے' پر اب کیا ہو سکتا ہے رسی کی کھیاں بھی واپس نہیں ہو سکتیں اور صبح-----

اس نے ناگواری سے سر ہلایا---- چھ بجے---- چھٹی والے دن ایک ہی تو لطف ہوتا ہے کہ دیر سے اٹھنا اور چھ بجے وہاں پہنچنا ہے' اس کا مطلب ہے پانچ بجے اٹھنا پڑے گا---- واقعی غلط ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا---- یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی' اس کے اکثر کام اسی طرح کے ہوتے تھے---- پہلے کر لینا پھر پچھتانا---- یہ پچھتاوا تو میرا مقدر ہے۔

شام تک ماحول کشیدہ رہا۔ شام کو چائے دیتے ہوئے بیوی نے کہا---- "میں نے تم سے بات تو نہیں کرنا تھی لیکن پھر کہتی ہوں یہ سامان واپس کر دو' تم ہمیشہ بعد میں پچھتاتے ہو' میری بات مان لو۔"

اس نے کہا---- "اب یہ ممکن نہیں' وہ واپس نہیں کرے گا۔"

"میں بات کروں گی' تم خود سوچو ہم نے اس چارپائی کا کرنا کیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا----- "مجھے پتہ ہے نا وہ واپس نہیں کرے گا۔"

بیوی پیر پٹختی کچن میں چلی گئی۔

رات کو کھانے پر بھی یہی صورت رہی۔ بیٹے منہ پھلائے الگ بیٹھے رہے بیوی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ اس سے نہ رہا گیا' بولا---- "چلو غلطی ہو گئی' اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ آپ کا پرانا جواب ہے۔" بڑے بیٹے نے کہا۔

"ہر بار غلطی۔" بیوی کی آواز میں تلخی آ گئی---- "کب تمہیں عقل آئے گی میں پوچھتی ہوں تمہیں چارپائی کا خیال آیا کہاں سے؟"

ابو تو کئی دن سے اوپر بھی نہیں چڑھے۔' چھوٹا بیٹا بولا---- "چارپائی کہاں سے دیکھ لی انہوں نے۔"

"میری اس پھوٹی قسمت سے۔" بیوی نے ماتھے پر ہاتھ مارا---- "پتہ نہیں یہ کم بخت چارپائی کیسے گھس گئی دماغ میں' میں کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ کچن کا ایگزاسٹ فین بدلوا دیں' صحیح کام نہیں کر رہا' اس کے لئے پیسے نہیں اور یہ چارپائی۔"

وہ کچھ نہ بولا---- بولتا بھی کیا' اپنے طور پر احساس ہو رہا تھا کہ بلاوجہ پیسے ضائع کر دے' چارپائی نہ بھی بنتی تو کیا فرق پڑتا۔ گھر کی اور کئی ضرورتیں توجہ چاہتی تھیں' لیکن بات وہی تھی کہ اب کیا ہو سکتا تھا ایک بار خیال آیا کہ سامان واپس کرنے کی کوشش کی جائے لیکن دکاندار کا رویہ وہ سارا منظر' اسے یقین تھا کہ سامان واپس نہیں ہو گا اب تو ایک ہی صورت تھی کہ صبح چھ بجے---- اور اس کے لئے اتوار والے دن' چھٹی والے دن صبح پانچ بجے اٹھنا---- اس نے بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی تھی۔

ہفتہ کی رات تھی۔ دیر تک گپ شپ لگانے اور رات گئے تک جاگنے کا معمول تھا لیکن بیوی کا موڈ اتنا خراب تھا کہ اس سے بات کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ کھانا کھا کر بیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی دیوار کی طرف منہ کئے لیٹ گئے۔ صبح پانچ بجے اٹھتے ہوئے بڑی کوفت ہوئی لیکن چھ بجے وہاں پہنچنا تھا۔ بندہ منتظر تھا۔ راستے میں اس نے کہا---- "یار بنا اچھی

طرح، اس چارپائی نے تو بڑا کام خراب کر دیا ہے۔"

"فکر ای نہ کریں جی، ایسی بنوں گا جو دیکھے گا واہ واہ کرے گا۔"

گھر پہنچا تو ابھی سب سو رہے تھے۔ وہ کام کرنے والے کو پچھلے ٹیرس پر لے گیا۔ سامان کا تھیلا اس کے سپرد کر کے کچن میں آیا اپنے لئے چائے بنائی اور لاؤنج میں اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد بیوی اٹھی۔ لاؤنج میں خالی پیالی دیکھ کر بولی۔

"چائے پینی تھی تو مجھے جگا دیتے۔" اب اس کے لہجے میں رات والی تلخی نہیں تھی۔

"وہ دراصل ------ جلدی جانا تھا نا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو لے آئے ہو اسے۔"

"بس یار ہو گیا --- اب جانے دو۔"

"یہ تو تمہارا پرانا وطیرہ ہے، پہلے کر لینا پھر پچھتانا۔"

"کیا کروں اب اس عمر میں عادتیں تو نہیں بدلتیں۔"

"تو جان اسی لئے تو کہتی ہوں کوئی کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لیا کرو۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اوپر چلا گیا۔ کاریگر ماہر تھا آدھی سے زیادہ چارپائی بنی گئی تھی اور رنگ برنگا پرندہ پورے ٹیرس پر چمک رہا تھا۔

دو تین گھنٹے بعد اسے واپس پہنچایا۔ بیوی اور بیٹوں نے چارپائی دیکھی تو سب نے تعریف کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ست رنگا پرندہ پر پھیلائے ٹیرس پر رقص کر رہا ہے۔

"چلو پیسے تو خرچ ہو گئے لیکن لگ اچھی رہی ہے۔" بیوی نے کہا۔

"بہت خوبصورت بنی ہے۔" بڑے بیٹے نے کہا۔

"اور رنگوں کا کمبی نیشن تو کمال کا ہے۔" چھوٹا بیٹا بولا۔ "ابو یہ ضرور آپ کی پسند ہے۔ دکاندار اتنی اچھی کمبی نیشن نہیں کر سکتا۔"

وہ خوش ہو گیا۔

"اب اسے رکھنا کہاں ہے۔" اس نے بیوی سے کہا۔ "بارشوں میں تو

خراب ہو جائے گی۔"

"ابھی تو ورانڈے میں رکھ دیں' پھر کوئی جگہ بناتی ہوں---- بھئی لگ خوبصورت رہی ہے۔"

دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے گپیں لگیں' کہیں کہیں چارپائی کا ذکر بھی آیا اور رنگوں اور بنائی کی خوب داد دی گئی۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو کر وہ ایک دوست کے ہاں نکل گیا۔ وہاں تاش کی بازی لگ گئی۔ واپس آیا تو شام ہو چلی تھی۔ بیوی سامان کی ایک لسٹ لئے بیٹھی تھی۔ بازار میں کافی دیر ہو گئی۔ واپسی پر کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانا کھا کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ سینے میں شدید جلن اور درد کا احساس ہوا۔ سانس بھی کچھ اکھڑ رہا تھا۔ بیوی نے بیٹے کو آواز دی---- "جلدی سے گاڑی نکالو' تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

چھوٹا بیٹا بھی آ گیا۔ دونوں بیٹوں نے اسے پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ بیوی نے اس کا سر زانو پر رکھ لیا اور جلدی جلدی کچھ پڑھنے لگی۔ گاڑی ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی حالت اور خراب ہو گئی۔ شاید سٹریچر پر ڈالتے ڈالتے یا ایمرجنسی کے بیڈ پر لٹاتے لٹاتے درمیاں میں کہیں سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

واپسی ایمبولینس میں ہوئی۔ بیوی ایمبولینس میں اور بیٹے پیچھے پیچھے گاڑی میں ایک کہرام مچ گیا۔ اڑوسی پڑوسی باہر نکل آئے۔ ایمبولینس سے سٹریچر اتار کر لاؤنج میں لائے تو کوئی بولا---- "لاش کہاں رکھنی ہے؟"

کسی نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا تو پڑوس والی بڑی اماں بولی۔ "گھر میں کوئی چارپائی نہیں؟"

"چارپائی" دونوں بیٹوں نے ہچکیوں کے درمیان ماں کی طرف دیکھا۔

"اوپر پڑی ہے" بیوی کی ہچکیاں بین میں بدل گئیں۔

لاؤنج کا صوفہ ایک طرف کر کے چارپائی درمیان میں بچھا دی گئی اور سٹریچر سے اس کا وجود چارپائی پر منتقل کر دیا گیا۔

"گھر میں چارپائی کتنی ضروری ہے۔" کسی عورت نے دوسری عورت کے کان میں کہا---- "اور ہمارے ان گھروں میں اب اس کا رواج ہی نہیں۔"

لاؤنج میں ست رنگا پرندہ پر پھیلائے چہک رہا تھا اور ناچ رہا تھا لیکن اس کی چہک کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی نہ اس کے رنگ کسی کو نظر آ رہے تھے!

جواز

یوں تو ساری زندگی ہی خوابوں اور سایوں کے پیچھے بھاگتے گزری ہے' دوسروں پر جلدی سے اعتماد کر لینا اور پچھتاوں کی کڑواہٹ کو چاٹتے ہوئے اپنے آپ کو کوسنا معمول ہے۔ کہیں مسکراہٹ کی ذرا سی کلی کھلی تو ادھر بگٹٹ دوڑ لئے۔ کسی نے ہاتھ پکڑ کر ذرا سی گرم جوشی سے دبایا تو اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا' لیکن جب مسکراہٹ کا سراب چمک کر دور ہوتا جاتا ہے اور گرم جوشی سے تھاما ہاتھ بے اعتنائی سے جھٹک دیا جاتا ہے تو میں اپنی ذات کی گپھا میں بھاگ جاتا ہوں اور گھٹنوں میں سر دے کر کسی کونے میں دبک جاتا ہوں۔ لیکن یہ دبکنا چند ہی دنوں کے لئے ہوتا ہے' اس کے بعد تازہ دم ہو کر پھر کسی پر اعتماد کرنے اور پرانے تجربوں کو دہرانے کو جی چاہتا ہے' مگر اس بار دھچکا اتنا زوردار تھا اور میں اپنی ذات کی گپھا میں اتنی گہرائی میں جا گرا تھا کہ لگتا تھا اب کبھی باہر نہ آسکوں گا---- اس بار معاملہ صرف مسکراہٹ کی کلیاں کھلنے اور بند ہونے یا جذبوں کی گنگناہٹ اور منہ موڑ لینے تک محدود نہ تھا' نہ ہی چھوٹے موٹے مالی نقصان کی بات تھی بلکہ اس بار تو سب کچھ چلا گیا تھا۔

ظفر سے میری ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ مہنگائی ان دنوں سب سے بڑا موضوع ہے۔ میں نے یوں ہی کہا---- "تنخواہ والے تو بے چارے جی رہے ہیں۔"

بولا---- "وہ تو ٹھیک ہے' لیکن آدمی کو کچھ نہ کچھ اور بھی کرنا چاہئے۔"

میں نے کہا---- ملازم کیا کر سکتا ہے۔ نہ اس کے پاس پیسہ ہے نہ وقت۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا---- "دونوں باتیں درست نہیں' درمیانے طبقے

کے لوگ تھوڑا بہت تو کر ہی سکتے ہیں۔ اب دیکھیں نا ہر گھر میں کچھ نہ کچھ زیور تو ہوتا ہے' پھر جی پی فنڈ ہے' پڑے پڑے کیا ملتا ہے' لیکن کسی معقول جگہ لگ جائے تو دنوں میں کئی گنا ہو سکتا ہے' رہی بات وقت کی تو کئی اچھے دیانتدار لوگ موجود ہیں' ان سے رفاقت ہو سکتی ہے۔"

پھر اس نے اسی سحرانگیزی کے ساتھ ایسے نقشے بنائے کہ مجھے اس کی ذہانت اور خلوص کا یقین ہو گیا۔

گھر آ کر بیوی سے بات کی تو وہ آسمان پر چڑھ گئی' غصے سے بولی---- "پچھلے تجربے یاد نہیں' اب پھر کسی چکر میں پڑنے لگے ہو۔"

میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ اپنی غلطیوں کا جواز ڈھونڈ لیتا ہوں اور یہ ثابت کر دیتا ہوں کہ جو بھی نقصان ہوا ہے اس میں سراسر قصور میرا تھا۔ چنانچہ اس بار بھی پچھلے سارے نقصانات کا' جن کی تفصیل میری بیوی کو ہمیشہ یاد ہوتی ہے' ذمہ دار خود کو ٹھہرایا' لیکن وہ نہیں مانی اور کہنے لگی---- "کچھ بھی ہو جائے میں تو ایک چھلہ بھی نہیں دوں گی اور نہ تمہیں قرض لینے دوں گی۔"

میں نے شانے اچکائے---- "تمہاری مرضی---- میں کون سا اقرار نامہ لکھ آیا ہوں۔"

ظفر سے دو تین دن بعد ملنے کا طے ہوا تھا' لیکن وہ کئی ہفتے نہیں ملا۔ میں نے اپنے طور پر اطمینان کا سانس لیا کہ چلو انکار کی کوفت سے بچ گیا۔ کئی ہفتوں بعد پھر کسی تقریب میں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنی کاروباری مصروفیت کا ذکر کر کے معذرت کی کہ اتنے دنوں سے مل نہ سکا۔

میں نے قدر شرمندگی سے کہا---- "میری تو بیوی ہی نہیں مانی۔"

بات شروع ہو گئی اور کافی دیر کی گفتگو کے بعد میں قائل ہو گیا کہ عورتیں طبعاً کم عقل ہوتی ہیں اور بہت سے معاملات میں ان کی رائے لینا ضرور نہیں ہوتا' بلکہ کچھ چیزیں ان سے چھپانا بھی چاہئے۔ تاکہ کسی وقت سرپرائز دے کر اپنی قابلیت اور ذہانت کا اعتراف کروایا جا سکے۔

اس کے بعد سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اب اگر ان کو ترتیب دینا

چاہوں تو ممکن نہیں۔ جی پی فنڈ کے علاوہ دو تین ایڈوانس اور بھی لے لئے۔ شروع شروع میں ظفر ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں ایک معقول رقم گھر آ کر دے جاتا۔ پھر اسے کاروبار میں اور وسعت کا خیال آیا۔ میں نے ہر ماہ ملنے والی اچھی خاصی رقم کے لالچ میں بیوی کو بھی منوا لیا۔ اس کا سارا زیور بھی اس کام میں لگ گیا۔ مکان کی رجسٹری رکھ کر بنک سے اور ڈرافٹ بھی مل گیا۔ دو ایک سال تو خوب گزرے۔ اس کے بعد ماہانے میں وقفہ آنے لگا۔ مندے کی شکایات اور ہر دو تین ماہ بعد ایک آدھ مہینہ غائب' پھر وقفہ بڑھنے لگا۔ چھ سات ماہ گزر گئے اور ایک دن معلوم ہوا کہ ظفر سب کچھ سمیٹ سمٹ کر کہیں غائب ہو گیا ہے۔

میں نے کئی دن بیوی کو کچھ نہیں بتایا---- بتاتا بھی کیا۔ تنخواہ کٹ کٹا کر اتنی بھی نہیں رہ گئی تھی کہ دال روٹی کا خرچ چل سکے۔ پھر اس دوران ماہانے کی امید پر اچھا خاصا قرض چڑھ گیا تھا۔ قسطیں ادا نہ ہونے کی وجہ سے بنک نے دھمکی دی کہ قسطوں کی ادائیگی فوراً" شروع نہ ہوئی تو مکان خالی کرا لیا جائے گا۔

مجھ میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں۔ معمول سے ہٹ کر ذرا سی بھی کوئی بات ہو جائے تو میں آنکھیں بند کر کے اپنی ذات کی گپھا میں دبک جاتا ہوں اور جب تک معمول اپنی جگہ نہ آ جائے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن اس بار معاملہ بہت سنگین تھا۔ بچوں کی فیس تک ادا کرنا مشکل ہو گیا---- قرض داروں کی دستک نے مجھے گھسیٹ کر اپنی گپھا سے باہر نکال لیا' سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اوپر سے بیوی کا تلخ و تند لہجہ اور طعنے۔ میں نے کہا نا کہ میں بہت چھوٹے دل کا ہوں۔ دو تین دن میں ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ خیال آیا کہ ایک گاڑی رہ گئی ہے اسے بیچ ڈالوں۔ زیادہ قیمت ملنے کی امید تو نہ تھی لیکن چند کام نکل ہی جاتے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے کاغذات تلاش کئے۔ معلوم ہوا کہ رجسٹریشن بک غائب ہے۔ ذہن پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ بس اتنا سا خیال آیا کہ ظفر کو ٹوکن لگوانے کے لئے دی تھی۔ شاید اس نے ٹوکن لگوایا ہی نہ ہو اب تو اس سے کسی بھی بات کی توقع ہو سکتی تھی۔

ایک پرانے جاننے والے رجسٹریشن آفس میں تھے' ان سے ملا' کہنے لگے---"آج کل تو بڑی سختی ہے۔ بہت گاڑیاں پکڑی گئی ہیں۔ یہ کام اتنا آسان

نہیں، تم نے تو کاغذات گم ہونے کی پولیس رپورٹ بھی نہیں کرائی، پہلے تو یہ کراؤ پھر ایک بیان حلفی اور-----"

یہ کئی دن کا کام تھا۔ امید کی جو ننھی سی کرن روشن ہوئی تھی، سو وہ بھی بجھ گئی۔ رجسٹریشن آفس سے نکلا تو بارش شروع ہو گئی، بڑی سڑک تک آتے آتے بارش تیز ہو گئی۔

"اب کیا کروں؟" میں نے اپنے آپ سے کہا--- "کوئی راستہ نہیں، اب تو قرض لینے والے دفتر تک آنے لگے ہیں۔"

اس زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے---- خیال سا آیا---- سارے جھنجھٹ سے نجات مل جائے گی۔ میں تو ذرا سی مشکل کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہوں اور یہ تو ایک پہاڑ تھا۔

بس مر جانا ہی بہتر ہے---- مجھے ایک سکون ملا۔

تیز بارش کی وجہ سے سڑک دور تک خالی تھی۔ بارش تھی کہ بس آج ہی برسے گی، بڑے پارک کے گیٹ پر ایک شخص بارش میں بھیگ رہا تھا اس نے دور ہی سے ہاتھ دیا۔ میری عادت ہے کہ کوئی ہاتھ دے تو غیر شعوری طور پر میرا پاؤں بریک پر آ جاتا ہے اور میں لفٹ مانگنے والے کو بٹھا لیتا ہوں۔ میری اس عادت پر کئی بار مجھے ٹوکا گیا کہ اس طرح میں کسی مصیبت میں بھی پڑ سکتا ہوں لیکن کسی کا اٹھا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ اب بھی یہی ہوا غیر شعوری طور پر میرا پاؤں بریک پر آیا۔ اچانک خیال آیا۔ "مجھے کیا" میں تو خود زندگی سے جانے والا ہوں" گاڑی آگے نکلی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے بھیگنے کا احساس ہوا۔ میں نے بریک لگائی اور گاڑی ریورس کی۔ بے دلی سے اگلا دروازہ کھولا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ نہ میں نے کچھ پوچھا نہ وہ کچھ بولا۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ دفعتہً احساس ہوا کہ وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں ذرا سا مڑا تو بولا۔ "آپ بہت تیز جا رہے ہیں"

مجھے احساس ہوا کہ میری سپیڈ غیر معمولی زیادہ ہے۔ کچھ کہے بغیر میں نے سپیڈ کم کی۔

قدرے توقف کے بعد پھر بولا۔ "آپ کچھ پریشان سے لگتے ہیں۔"
میں چونکا' غور سے اسے دیکھا---- "ہاں------ نہیں تو"
وہ مسکرایا---- "شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں"
"مدد" میں نے تلخی سے کہا---- "آپ کیا کر سکتے ہیں؟"
"شاید کچھ کر سکوں---- اور کچھ نہیں تو حوصلہ تو دے ہی سکتا ہوں۔"
میں پھر چونکا---- "کیسا حوصلہ؟"
"حالات سے مقابلے کرنے کا" اس نے سکون سے جواب دیا۔ بارش کا زور کچھ کم ہوا۔ اگلے موڑ سے مجھے مڑنا تھا۔ میں نے کہا--- "میں تو دائیں مڑوں گا' آپ نے کہاں اترنا ہے؟"
"مڑ کر ذرا سا آگے۔"
موڑ مڑ کر میں نے استفسار سے اس کی طرف دیکھا تو بولا۔ "اگر آپ محسوس نہ کریں تو یہ سامنے ہٹ میں ایک کپ چائے پی لیں' آگے سڑک خراب ہے اور بارش پھر تیز ہو رہی ہے۔ آپ ذرا نارمل ہو جائیں گے۔"
نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ ہٹ میں چلا گیا۔
چائے کا آرڈر دے کر وہ بولا---- "آپ سوچتے ہوں گے ایک اجنبی کیوں اصرار کر رہا ہے' لیکن آپ اچھے آدمی ہیں۔ میں نے کئی گاڑیوں کو ہاتھ دیا کوئی نہیں رکا---- شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں' آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"
اب یاد آتا ہے کہ اس کے لہجے میں کچھ ایسی اپنائیت اور ہمدردی تھی کہ شاید میرے آنسو نکل آئے تھے۔ میں نے کہا "بس اپنی حماقتوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔"
وہ سراپا سوال بنا مجھے دیکھتا رہا۔
چائے پیتے ہوئے میں نے اسے مختصراً" کہانی سنائی۔ ایک سکون سا ملا۔ یوں لگا جیسے بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔
وہ چند لمحے چپ رہا پھر بولا---- "سب سے پہلے تو بنک کا معاملہ ٹھیک ہونا

چاہئے۔"

"لیکن کیسے؟"

"ہیڈ آفس میں ایک اچھا آدمی ہے۔ وہ تو مجھے نہیں جانتا لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ بڑا ہمدرد ہے' آپ اس سے ملیں۔"

میں نے کہا---- "کیا فائدہ؟ وہ کیا کر سکے گا۔"

بولا--- "مل لینے میں کیا حرج ہے؟"

اگلے دن میں ہیڈ آفس گیا۔ جس شخص کا حوالہ اس نے دیا تھا وہ ایسے ملا جیسے مجھے برسوں سے جانتا ہو۔ میری ساری روداد سن کر اس نے مجھے تسلی دی اور بولا۔ "فوری طور پر تو قرقی کا نوٹس واپس ہونا چاہئے۔ باقی باتیں بعد کی ہیں---- میں کوشش کرتا ہوں' آپ آرام سے بیٹھیں میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے؟"

تین چار گھنٹے کی کوشش سے نوٹس واپس ہو گیا۔ چھ مہینے کی مہلت بھی مل گئی۔ لگا جیسے کسی بوجھ کے نیچے سے نکل آیا ہوں۔ واپسی پر وہ مجھے وہیں ملا۔ میں نے گاڑی روک کر اسے بٹھایا۔ بولا۔ "کیا رہا۔"

میں نے ساری بات بتائی اور کہا---- "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے' تم یہ مشورہ نہ دیتے تو میں کل اپنے آپ کو ختم کر چکا ہوتا۔"

اس نے کہا---- "اللہ کچھ نہ کچھ سبب بنا ہی دیتا ہے۔"

موڑ پر پہنچے تو بولا---- "مجھے تو یہیں اترنا ہے۔ ایک کپ چائے ہو جائے۔"

میں نے کہا--- "ضرور ضرور---- لیکن آج چائے میں پلاؤں گا۔"

"چلئے آپ ہی پلا دیجئے۔"

چائے پیتے ہوئے کہنے لگا--- "ایک مسئلہ تو حل ہوا۔"

میں نے کہا---- "لیکن یہ تو وقتی کام ہے' اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ رقم کہاں سے آئے گی۔"

بولا---- "ایک صورت ہے' اگر کوئی اچھا پارٹ ٹائم کام مل جائے تو۔"

میں نے کہا---- "کیا بات کرتے ہو' آج کل تو جوان بے کار پھر رہے ہیں

مجھے کون کام دے گا۔"

بولا------ "ایک جگہ ہے---- ان کو ضرورت ہے' آپ ان سے جا کر ملیں۔"

دوسرے دن میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا' تھوڑی سی گفتگو کے بعد ایک خاصی معقول رقم پر معاملہ طے ہو گیا۔ امید کی کچھ اور کرنیں روشن ہو گئیں۔

تین چار یا شاید کچھ زیادہ دن بعد وہ وہیں گیٹ پر ملا۔

بیٹھا تو میں نے کہا------ "یار تم تو میرے محسن ہو' لیکن مجھے ابھی تک تمہارا نام ہی معلوم نہیں' تم کون ہو' کیا کرتے ہو' کہاں رہتے ہو؟"

وہ ہنسا---- "آپ نے تو ایک ہی سوال میں سب کچھ پوچھ لیا۔ میرا نام منور ہے' ایم۔ اے فائنل میں ہوں اور رہتا ہوں دھمیال روڈ پر۔"

میں نے کہا---- "دھمیال روڈ تو بہت بڑی ہے۔ کبھی ملنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

بولا---- "چونگی سے دائیں جو سڑک اندر کو جاتی ہے اس پر کوئی دو سو گز آگے گیٹ والی گلی ہے۔ اس گلی میں دائیں طرف دوسرا گھر ہے---- خیر آپ بتائیں' کام ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا---- "ہاں ہو گیا---- میں وہاں پہنچا تو وہ لوگ حیران ہوئے کہ ایک دن پہلے ہی تو وہ جگہ خالی ہوئی تھی مجھے کیسے پتہ چل گیا۔"

کہنے لگا "چلیں کام ہو گیا---- وہ اچھے لوگ ہیں۔ ایک دو ماہ کام کر کے ان سے کچھ ایڈوانس لے لیں اور اپنے معاملات درست کریں۔"

موڑ آیا تو وہ اترنے لگا۔

میں نے پوچھا---- "یار تم یہاں آتے کہاں ہو؟"

کہنے لگا---- پارک کے پیچھے کالونی میں ایک دوست رہتا ہے' اس کے ساتھ مل کر تیاری کر رہا ہوں اور یہاں سے دھمیال کی ویگن آسانی سے مل جاتی ہے۔"

چند دنوں میں کئی بگڑے کام سیدھے ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ منور کی

حوصلہ افزا باتوں اور مشوروں نے میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا اور میں آہستہ آہستہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے لگا۔

منور سے دو چار دن بعد گیٹ پر ملاقات ہو جاتی۔ کبھی آٹھ دس دن بھی ہو جاتے۔ وہ موڑ تک میرے ساتھ آتا' کبھی موڈ ہوتا تو ہم ہٹ میں چائے پیتے اور پھر اپنی اپنی راہ لیتے۔ چھ ہی مہینے میں اس کے مشوروں اور اطلاعات سے گھر بنک کی قید سے آزاد ہو گیا اور تھوڑے بہت قرضے بھی اتر گئے۔ دفتر کے علاوہ میں دو جگہ پارٹ ٹائم بھی کرنے لگا۔ اسی دوران ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ میرا ایک کیس کئی برسوں سے التوا میں تھا اور اب اس کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید بھی نہ تھی' منور کے مشورے سے میں ایک ایسے بااختیار شخص تک جا پہنچا جس نے ایک اصولی فیصلہ کرا کے کیس میرے حق میں کرا دیا۔ ترقی بھی ہو گئی اور پچھلے کئی برسوں کے بقایا جات بھی مل گئے۔ اس کے بعد ایک اور اہم بات ہوئی' ایک دن کہنے لگا----

"آپ فوری طور پر کچھ پیسوں کا انتظام کر سکتے ہیں۔"

میں نے پہلی بار قدرے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "کتنے"

میرا خیال تھا کہ وہ قرض مانگنے والا ہے۔

"یہی کوئی دو ڈھائی لاکھ"

میں نے لمحہ بھر سوچا۔ اس کے احسانات کا اندازہ کیا اور رکتے ہوئے کہا۔ "اتنے تو شاید نہ ہو سکیں۔"

"کچھ کیجئے" وہ بولا----- "ایک بہت عمدہ سودا ہے۔"

سودے کے نام پر میں چوکنا ہو گیا----- "کیسا سودا؟"

"ایک جگہ بک رہی ہے لیکن بیچنے والے کو معلوم نہیں کہ چھ ماہ بعد وہ جگہ نئی ہائی وے سے مل جائے گی اور اس کی قیمت لاکھوں میں ہو جائے گی۔"

میں نے کہا---- "نہ بھئی میں اب کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں ایسے معاملات کا اہل ہی نہیں۔"

وہ لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا---- "میری وجہ سے آپ کو اب تک کوئی نقصان ہوا ہے۔"

میں نے کہا---- "کیا بات کرتے ہو---- تمہیں معلوم نہیں جس دن میری تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی' وہ بارش والے دن---- تم نہ ملتے تو خودکشی کر چکا ہوتا' تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

بولا---- "تو پھر میری بات مانئے۔"

میں نے کہا---- "لیکن اتنی رقم کہاں سے آئے گی۔"

کہنے لگا---- "ایک تو گاڑی بیچ دیں۔"

"گاڑی" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں---- یہ بڑے فائدے کا سودا ہے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا' پھر کہنے لگا---- "مجھ پر اعتماد کریں۔"

میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ "لیکن میری بیوی تو----"

"اسے ابھی نہ بتائیں---- کہہ دیں کہ کوئی دوست چند دنوں کے لئے لاہور لے گیا ہے۔"

مجھے تذبذب میں دیکھ کر بولا---- "یہ کام کل ہی ہونا چاہئے' چلئے میں آپ کی مدد کروں گا۔ صبح دس بجے جی پی او کے سامنے آجائیں' ڈیلر کے پاس اکٹھے چلیں گے۔"

رات بھر میں شش و پنج میں رہا۔ اس کے پچھلے مشوروں کے بارے میں سوچتا تو جی کہتا اس کی بات مان لینا چاہئے لیکن اب تک میرے ساتھ جو جو کچھ ہوا تھا اس سے ڈر لگتا تھا کہ یہ بھی کوئی فریب نہ ہو۔ شاید اب تک وہ اسی چکر میں میرے ساتھ لگا ہوا ہے اور پھر دو ڈھائی لاکھ معمولی رقم بھی نہیں۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کسی چکر میں نہیں آؤں گا۔ بس جو کچھ ہے یہی کافی ہے۔

صبح بیوی نے سرخ آنکھیں اور بے چینی دیکھی تو بولی---- "کیا بات ہے---- تم ٹھیک ہو نا۔"

میں نے کہا---- "ٹھیک ہوں' ذرا نیند ٹھیک سے نہیں آئی۔"

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

گھر سے نکلتے ہوئے میں نے اپنے فیصلے کو دل ہی دل میں دہرایا لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ دفتر جانے کی بجائے میں جی پی او کے سامنے پہنچ گیا' یوں لگا جیسے کوئی مجھے کھینچ کر وہاں لے گیا ہے۔

وہ موجود تھا۔

تین چار گھنٹے مختلف ڈیلروں کے چکر لگا کر آخری گاڑی ڈیڑھ لاکھ میں نکل گئی۔ رقم جیب میں رکھتے ہوئے میں چپ چپ سا تھا۔ یوں لگتا تھا کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔

وہ غیر معمولی طور پر کھلکھلاتا رہا۔ مجھے اور شک ہو گیا کہ ضرور کوئی چکر ہے۔ ایک جگہ چائے پی کر ہم شہر سے سات آٹھ کلومیٹر دور ایک گاؤں پہنچے۔ تھوڑی سی بحث کے بعد معاملہ طے ہو گیا۔ رقم ادا کر دی گئی اور باقی پچاس ہزار رجسٹری کے ساتھ ادا ہونے قرار پائے۔ رجسٹری چار دن بعد ہونا تھی۔

گھر پہنچا تو بیوی نے پوچھا--- "گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے اس کی بتائی ہوئی کہانی دہرا دی۔ اسے کچھ یقین آیا۔ کچھ نہ آیا یہی حال میرا اپنا تھا۔ یہ کچی رسید کیا حیثیت رکھتی تھی۔ چار دن بڑی پریشانی میں گزرے۔ مجبوراً" پچاس ہزار کا اور انتظام کرنا پڑا' لیکن چوتھے دن جب باقاعدہ رجسٹری ہو گئی اور اگلے دو دنوں بعد رجسٹری میرے ہاتھ میں آ گئی تو قدرے اطمینان ہوا لیکن پھر بھی یہ ڈر رہا کہ زمین کسی کام کی بھی ہے یا نہیں۔ پانچ چھ دن گزر گئے تو بیوی نے گاڑی کے بارے میں مسلسل سوال کرنا شروع کر دیئے۔ مجھ میں بات چھپانے کی ذرا بھی صلاحیت نہیں۔ دو چار دن اور گزرے اور اس کے سوالات بڑھنے لگے تو میں نے اسے بتا دیا کہ گاڑی بیچ کر زمین لے لی ہے۔

غیر متوقع طور پر وہ کچھ نہیں بولی' صرف یہ پوچھا--- "کچھ فائدہ ہو گا؟"

میں نے کہا--- "سنا ہے وہ جگہ جلد ہی نئی ہائی وے سے ملنے والی ہے۔"

وہ قدرے چپ رہی پھر بولی "بیچنے والے کو معلوم نہیں۔"

"نہیں"

"تو آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

اب میں چپ ہو گیا' قدرے چپ رہا پھر بولا---- "بس کہیں سے معلوم ہو گیا۔"

"چلیئے ایک تجربہ اور سہی" اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا---- "بہر حال زمین تو ہے۔"

مجھے اتنی جلدی بات ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔

گاڑی نہ ہونے سے میرا راستہ اور معمول بدل گیا۔ اس سے ملاقات کی صورت نہ رہی' کچھ میں بھی مصروف ہو گیا۔ اس دوران وہ مجھے دو چار بار ویگن شاپ پر ملا۔

ایک دن میں نے کہا---- "یار اب تو ملاقات سے بھی گئے۔"

بولا---- "میری مصروفیت بھی شروع ہو گئی ہے۔ امتحان قریب ہیں۔"

یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

کوئی پانچ ماہ بعد کی بات ہے ایک صبح میری بیوی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"کیا ہوا" میں نے گھبرا کر کہا۔

اس نے اخبار میرے سامنے کر دیا۔

"خیر ہے نا۔" میں نے عینک ڈھونڈتے ہوئے نیم غنودگی میں پوچھا۔

"یہ خبر---" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

خبر تھی---- "نئی ہائی وے میں تبدیلی۔"

ایک ہفتہ میں زمین خریدنے والے اتنے لوگ آئے کہ جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ قیمت سن کر بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں بولی۔

"تم نے پہلی بار کوئی کام کیا ہے۔"

کچھ دن اور انتظار کرتا تو شاید اس سے بھی زیادہ قیمت ملتی' لیکن میری بے صبری اور بے یقینی نے زیادہ انتظار نہ کیا' پھر بھی اتنے پیسے ملے گئے کہ میں ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ منور اس ساری بات سے واقف ہو گا' اسے تو پہلے ہی معلوم

تھا کہ نئی ہائی وے کا راستہ تبدیل ہو رہا ہے۔ میں اسے نئی صورت حال کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ نئی گاڑی میں پارک کے گیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی دفعہ غیرارادی طور پر رکا لیکن اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ آخر ایک اتوار میں نے اس کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا۔

چونگی سے اندر مڑ کر گیٹ والی گلی آسانی سے مل گئی۔ گاڑی باہر کھڑی کر کے، گلی میں دائیں طرف والے دوسرے گھر کی بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر نے دروازہ کھولا۔

میں نے کہا۔۔۔ "منور صاحب ہیں۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"یہیں سے"

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر آہستہ سے بولا۔۔۔ "شاید آپ کو معلوم نہیں۔"

"کیا؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں۔"

"یہ کب ہوا؟"

"دو سال سے تو زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔"

"کیا"۔۔۔۔ میں نے حیرانی سے کہا۔۔۔ "وہ تو مجھے بڑے پارک کے گیٹ پر....."

اس نے میرا جملہ پورا نہیں ہونے دیا، جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو، بولا۔۔۔ "بڑے پارک کے گیٹ پر ہی تو ویگن نے اسے کچلا تھا۔"

"ویگن نے۔"

"پارک کے پیچھے کالونی میں اپنے دوست کے پاس ایم۔ اے کی تیاری کرنے جاتا تھا نا۔۔۔۔" وہ ایسے خواب آلود لہجے میں بول رہا تھا، جیسے اس کا مخاطب میں نہیں کوئی اور ہے۔

"لیکن"۔۔۔۔۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ نہیں سوجھے۔

خاموشی سے کچھ کہے بغیر میں واپس آ گیا۔

تلاش

فلائنگ کوچ کی بیک سیٹ سے ٹیک لگائے اس نے ایک اچٹتی سی نظر بھاگتے درختوں اور کھمبوں پر ڈالی۔ ایک لمحے میں یوں لگا جیسے کسی نے اسے حال کے چبوترے سے ماضی کے دھندلکوں میں دھکیل دیا ہو۔ کوچ اس وقت جہلم کے پل سے گزر رہی تھی۔

اس پل سے گزرتے ہوئے ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ منظر ایک دوسرے میں الجھ جاتے ہیں۔ کابل سے دہلی جاتی ہوئی جرنیلی سڑک پر دو رویہ گھنے درختوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوا حال اور ماضی کے درمیان کسی نامعلوم لمحے میں منجمد ہو جاتی ہے۔ تھکے ہوئے گھوڑوں کی کمزور ہنہناہٹ' سستی سے نیچے اترتے سوار' درختوں کے تنوں سے اپنے اپنے گھوڑے باندھ کر عمامے ڈھیلے کرتے ہیں' اور دریا کے کنارے کی طرف چل پڑتے ہیں۔ کنارے کی کچی مٹی پر بیٹھ کر دھول زدہ سوکھے چہروں پر تازہ پانی کے چھینٹے مارتے ہیں' پھر سبز مخملی گھاس پر' گھوڑوں سے اتارے غاشئے بچھا کر کمر سیدھی کرنے لیٹ جاتے ہیں۔

لہور ---- ابھی بہت دور ہے۔ ان میں سے ایک سوچتا ہے' مستقبل کا سنہری دھندلکا آہستہ آہستہ اسے غنودگی کی بغل میں کھسکا دیتا ہے۔

"ابو ---- ہم لاہور کب پہنچیں گے؟"

وہ چونک پڑتا ہے۔ فلائنگ کوچ جہلم سے گزر کر سرائے عالمگیر میں داخل رہی ہے۔

"آغا نعمت ----" اس کا ساتھی حسن جان گھوڑا برابر لاتے ہوئے کہتا ہے۔ وہ اپنے خیالوں' دھندلکوں میں دور نکلا ہوا ہے۔ واپس آتے کچھ دیر لگتی ہے ---- "ہوں"

"آغا نعمت!"--- حسن جان اس کے برابر ہوتے ہوئے کہتا ہے "میں دیکھ رہا ہوں ہم جوں جوں منزل کے قریب پہنچ رہے ہیں، تمہارے چہرے پر تردد اور فکر گہری ہوئی جا رہی ہے؟"

"اچھا----" اس کی آواز بہت دھیمی ہے---- "شاید"

خیال آتا ہے کہ اگر لہور پہنچ کر بھی گوہر جان نہ ملی تو کیا ہو گا؟ سوچتا ہے "جانے وہ اس وقت کہاں ہو گی شاید لہور میں، یا پھر آگے نکل گئی ہو"

"کیا بات ہے" حسن جان کہتا ہے----- "تم کسی الجھن میں ہو۔"

"نہیں تو"---- پھر خود ہی تردید کرتا ہے---- "شاید"

"کسی کو ڈھونڈنے جا رہے ہو یا نوکری کی تلاش ہے" حسن جان اسے کریدتا ہے۔

"شاید دونوں ہی----" وہ کہیں ڈوبے ڈوبے جواب دیتا ہے۔ یہ تو اسے خیبر سے گزرتے ہوئے معلوم ہو گیا تھا ملاں وجد اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ وہاں سے گزرا تھا۔ پشاور میں اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اگلی منزل لہور ہی ہو سکتی ہے۔ گوہر جان سے آخری ملاقات یاد آ گئی۔ آلوچوں کے باغ میں پھول ابھی کھل رہے تھے۔ اس کی ہرنی ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

"ابا اب نہیں مانتے، وہ ہرات چھوڑنا چاہتے ہیں، لہور یا پھر آگے دہلی جانا چاہتے ہیں"

"وہاں جا کر کیا کریں گے"

"ہم دونوں بہنوں کو کسی امیر کے حرم میں پیش کر دیں گے اور اس کے بدلے میں کوئی خلعت----" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا، کبھی نہیں جانے دوں گا اس نے گوہر جان کا ہاتھ اس مضبوطی سے تھاما جیسے کوئی اسے اسی وقت چھین رہا ہو۔

لیکن جب وہ ہرات سے نکلی تو اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اسے ایک آدھ دن کے لئے ہرات سے جانا پڑا، وہاں ایک ہفتہ لگ گیا۔ لوٹا تو ہرات اجڑ چکا تھا۔

"ابو------- ہم لاہور میں کہاں ٹھہریں گے۔" بیٹے کے سوال نے

چونکا دیا۔

"کہیں بھی-----" اس نے بے خیالی میں کہا۔

"پھر بھی-----" بیٹا مصر تھا۔

"یار کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے"

"میں تمہیں سرائے میں نہیں ٹھہرنے دوں گا' میرے ساتھ چلو" حسن جان نے گھوڑے کو تھپکی دی۔ دلکی چال چلتے گھوڑے نے گردن ہلا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"تمہارے ساتھ"

"ہاں میرے ساتھ----- میرے چچا شاہی فوج میں ہیں' تمہیں نوکری بھی مل جائے گی"

اس کی آنکھوں میں چمک آئی---- "تو تمہارے چچا شاہی فوج میں ہیں----- ٹھیک ہے"

"ابو! آپ کا کام تو اترسوں ہے نا' دو دن ہم کیا کریں گے" بیٹے کے لہجے میں شوق اور بے تابی تھی۔

"گھومیں گے---- تمہیں لاہور دکھاؤں گا۔"

"تم سارا سارا دن کہاں پھرتے رہتے ہو۔"

حسن جان نے پوچھا---- "کسے تلاش کر رہے ہو؟"

اس نے اداسی سے کندھے اچکائے---- "جسے ڈھونڈھ رہا ہوں اس کا دور دور تک پتہ نہیں---- ایک ایک جگہ دیکھ ڈالی' شاید وہ لوگ دہلی کی طرف نکل گئے ہوں۔"

"لیکن شہنشاہ تو ان دنوں لہور میں ہیں' دہلی جا کر کوئی کیا کرے گا؟"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو" اس نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا' اور سوچا------ شاہی قیام گاہ اور باغ کی بھی ٹوہ لے لینی چاہیے۔

تیسرے دن دوپہر کے بعد سرکاری کام سے فراغت ہو گئی۔ انہوں نے اگلے دن واپس جانا تھا۔ شام تک کا وقت خالی تھا۔ بیٹے سے کہا---- "لاہور تو تم نے

دیکھ لیا' چلو اب پرانی انار کلی چلتے ہیں۔ فالودے کا ایک ایک پیالہ کھائیں گے اور پھر تمہاری امی کے لئے کچھ کپڑے خریدیں گے۔"

بیٹے نے نفی میں سر ہلایا اور بولا---- "ابھی تو شالامار رہتا ہے وہاں چلتے ہیں"

شالامار جاتے ہوئے ہمیشہ اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ کچھ خاموشی کے بعد بولا---- "چھوڑو' اب وہاں کیا رکھا ہے؟"

"نہیں میری کتاب میں اس پر مضمون ہے تصویر بھی ہے۔ میں تو ضرور دیکھوں گا۔"

وہ انکار نہ کر سکا۔

شالامار میں داخل ہوئے تو ایک عجب ویرانی کا احساس ہوا۔ پہلے تختے کے فوارے چل رہے تھے' دوسرے تختے پر اترے ہی جیسے سارا منظر بدل گیا۔

شالا مار ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اپنی اصل حالت میں آ گیا' مہکتا' لہکتا' گنگناتا شالامار۔

گوہر جان نے مڑ کر اسے دیکھا اور خوف زدہ آواز میں بولی----" تم---- تم یہاں کیوں آئے ہو' کیسے آئے ہو' تمہیں معلوم نہیں؟"

"بڑی مشکلوں سے تو یہاں پہنچا ہوں" وہ ایک گھنے درخت کی اوٹ میں ہوتا ہوا بولا---- "تمہیں تلاش کرتے"

"لیکن"

"لیکن کیا------"

"تم اندر کیسے آئے" سہمی ہوئی گوہر جان نے پوچھا۔

"میں نے تاریکی کا فائدہ اٹھایا اور اس پچھلی دیوار پر کمند ڈالی' لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو' مجھے دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

گوہر جان چند لمحے چپ رہی---- یہ چند لمحے صدیوں جیسے طویل تھے۔

"میں اب----" وہ پھر چپ ہو گئی اور بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

"کچھ تو کہو----"

"میں اب شاہی حرم میں ہوں" اس نے جلدی سے جملہ مکمل کیا۔

"کیا----" اس کی چیخ نکل گئی۔

"آہستہ بولو" وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی---- "خدا کے لئے"

"لیکن------" اس نے کہنا چاہا۔

اسی وقت بگل کی آواز بلند ہوئی۔ ایک سایا تاریکی میں سے لپک کر ان کے پاس آیا---- "گوہر جان جلدی کرو' وہ ادھر ہی آ رہے ہیں"

گوہر جان گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی---- "چلے جاؤ---- خدا کے لئے کہیں چھپ جاؤ۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی---- "خدا کے لئے"

وہ گوہر جان کے نرم ہاتھوں کے دباؤ سے یوں پیچھے ہٹا جیسے کسی طاقت ور ہاتھ نے اسے دور دھکیل دیا ہو----

گوہر جان گھبرائی ہوئی تھی' خوف زدہ نظروں سے اس نے ادھر ادھر دیکھا' پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی تاریکی میں گم ہو گئی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار کے قریب گھنے درخت کے تنے سے جا لگا۔

"ابو! کہاں کھو گئے ہیں" بیٹے نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

گھنا درخت اسی طرح کھڑا ہے' لیکن اب اس کا تنا کھوکھلا ہو چکا ہے۔ قریب ہو کر اس نے اندر جھانکا۔ تنا اندر سے خالی تھا۔ چیونٹیوں اور کیڑوں کی قطاریں کھوکھلے تنے میں نیچے سے اوپر جا رہی تھیں----- اس کے سارے جسم پر درد کی سوئیاں چبھنے لگیں۔ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی سے بڑے دروازے کی طرف دوڑا۔

بڑے دروازے پر بھاری پہرہ تھا۔

اس کے قدم رک گئے----- بیٹے نے پوچھا---- "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں" وہ بڑبڑایا----- "پکڑا تو جانا ہی تھا' نکلنے کا اور کوئی راستہ جو نہ تھا"

"کہاں سے نکلنے کا راستہ" بیٹے نے حیرانی سے پوچھا۔

اسے اپنی گردن پر رسی کے پھندے کی اکڑاہٹ سخت ہوتی محسوس ہوئی---- سخت ہوتی گئی۔

بڑے دروازے سے تیزی سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا----- دور' سب سے نچلے تختے کے کنارے گوہر جان خوف زدہ آنکھوں' پھٹی سہی آواز سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھول تمنا کا ویران سفر

یہ روز کا معمول ہے کہ سر شام ہی وہ بسوں کے اڈے پر آتا ہے اور دائیں کونے میں دیوار کے ساتھ لگی بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ ذرا فاصلے پر چائے کا ایک کھوکھا ہے چائے والا اس کی عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس کے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد وہ چائے کا مگ اس کے لئے بھجوا دیتا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ ایک چمچ چینی پیتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کتنی دیر بعد مگ واپس لانا اور پھر کتنی دیر بعد اور کتنی بار چائے بھجوانا ہے۔

وہ وہاں اتنے برسوں سے آ رہا ہے کہ سروس کرنے والا ہر لڑکا جاتے ہوئے دوسرے کو اس کے بارے میں بتا جاتا ہے۔ کھوکھے پر کوئی بھی آئے اس کے لئے سروس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چائے لانے والا جانتا ہے کہ وہ بار بار چائے کے پیسے نہیں دیتا بلکہ جب آخری بس آ چکتی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے' بس سے اترنے والے آخری مسافر کے اترنے کے انتظار کے بعد مایوسی سے بس کے اندر جھانکتا ہے اور واپس بنچ پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اتنی دیر میں اڈے کے مختلف سٹال بند ہونے لگتے ہیں۔ چائے والا بھی برتن سمیٹنے لگتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے' جیب سے پیسے نکال کر چائے لانے والے لڑکے کے ہاتھ پر رکھتا ہے اور باقی کا انتظار کئے بغیر بوجھل قدموں سے اڈے سے نکل جاتا ہے۔

کئی برس پہلے جب اس نے اس اڈے پر باقاعدہ آنا شروع کیا تو کئی لوگوں نے اسے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ کچھ نے اسے سی آئی ڈی کا آدمی سمجھا جو کسی سرکاری ڈیوٹی پر وہاں آنے لگا تھا' لیکن اس کی وضع قطع اور گفتگو سے کسی کو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ سب اس کے عادی ہوتے گئے اور برسوں بعد اب وہ بھی اس اڈے کی دوسری چیزوں کی طرح اس کا ایک حصہ بن گیا تھا۔۔۔۔

لیکن اب بھی کبھی کبھار جب کسی ہوٹل یا دکان میں کوئی نیا شخص آتا تو اس کے بارے میں ضرور پوچھتا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آتا ہے اور کیوں آتا ہے؟ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ادھیڑ عمر کا ایک پر کشش شخص ہے جس کے انداز و عادات سے کھاتے پیتے گھرانے سے ہونے کا امیج بنتا ہے۔ سرشام خاموشی سے اڈے کے احاطے میں داخل ہوتا ہے اور دائیں کونے میں دیوار کے ساتھ لگی بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر بنچ خالی نہ ہو تو انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ جونہی بنچ خالی ہوتی ہے' اپنی جگہ سنبھال لیتا ہے۔ کھوکھے والا اس کے بیٹھنے کا منتظر ہوتا ہے۔ جونہی وہ بیٹھتا ہے' چائے کا مگ بھجوا دیتا ہے۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ آنے والی بس کو اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ ایک ایک سواری کے چہرے کو شوق سے پڑھتا اور شناسائی کی کوئی کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ سواریاں اتر اتر کر احاطے میں سے ہوتی ہوئی بڑی سڑک پر تانگوں' ٹیکسیوں اور گاڑیوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ بس کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں جو ایک نامعلوم سی چمک پیدا ہوتی ہے' بجھ جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ دیکھ رہا ہے لیکن یہ آنکھیں کسی انسانی چہرے پر نہیں' کسی مجسمے میں لگی ہوئی ہیں جس پر کوئی تاثر' کوئی حیرت' کوئی خوشی نہیں۔ یہ کیفیت اس وقت تک رہتی ہے جب تک اڈہ خالی رہتا ہے۔ جونہی کوئی بس اڈے میں داخل ہوتی ہے اس کا چہرہ یکدم جاگ اٹھتا ہے اور بیک وقت کئی تاثر اس پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ بس کے آتے ہی اس کا چہرہ تجسس سے کھل اٹھتا ہے۔ امید اور خوشی کے ملے جلے رنگ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں اور جونہی پہلی سواری دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہے اس کے جسم پر ایک عجیب طرح کی کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ جوں جوں سواریاں اترتی جاتی ہیں اس کے چہرے پر پھیلی امید گہری ہوتی جاتی ہے۔ پھر آخری سواری بھی اتر جاتی ہے۔ بس کا خالی دروازہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر آنکھ مچولی کھیلتے رنگ ایک ایک کر کے مدھم پڑنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جاگا ہوا چہرہ مجسمے میں ڈھلنے لگتا ہے اور پتھر ہوتا جاتا ہے---- بس دو آنکھیں رہ جاتی ہیں جو حسرت اور ناکامی سے خالی بس کو دیکھے جاتی ہیں۔

اس کی دلچسپی صرف باہر سے آنے والی بسوں میں ہے۔ یہاں سے جانے والی بسوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ایک زمانے میں جب یہ اڈہ چھوٹا تھا تو جانے والی بسیں بھی اسی حصے میں ہوتی تھیں۔ لیکن پچھلے چند برسوں میں توسیع کے بعد صرف آنے والی بسیں رکتی ہیں۔ یہاں سے جانے والی بسیں مین گیٹ کی طرف کھڑی ہوتی ہیں۔ اس حصے میں شور شرابا بھی زیادہ ہوتا ہے، لیکن اس طرف آنے والی بسیں ہی رکتی ہیں، جس کی وجہ سے عام طور پر ایک سناٹا طاری رہتا ہے اس سناٹے میں چائے کا کھوکھا ہی زندگی کی ایک علامت ہے۔

شروع شروع میں چائے والے کا خیال تھا کہ وہ کسی کو لینے آتا ہے۔ لیکن جب کئی دن، پھر کئی مہینے اور اب کئی سالوں سے آنے والا نہ آیا تو اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید تنہا آدمی ہے اور شام کا یہ ورد وقت گزاری کا ذریعہ ہے۔ بات معقول بھی تھی، لیکن اس ورد میں جو ایک عبادت کا سا تقدس تھا وہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور پریشان کرتا تھا۔ خود اس سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کیونکہ اس کی شخصیت میں ایک ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ آسانی سے بے تکلف ہونا ممکن نہ تھا۔ سو چائے والے نے اسے اسی طرح قبول کرلیا اور اسے بھی اڈے کی دوسرے چیزوں کی طرح ایک چیز سمجھ لیا۔ اب اس کا روز آنا عجیب نہ لگتا نہ اس کے انتظار کے تقدس میں حیرت دکھائی دیتی اب تو شاید یہ عجیب ہوتا کہ وہ کسی دن نہ آئے۔ لیکن اس کا روز آنا مقرر تھا۔ بارش ہو یا آندھی، گرمی ہو یا سردی، وہ سرشام وہاں پہنچ جاتا اور دیوار کے ساتھ والی بنچ کی طرف لپکتا۔ خالی ہوتی تو بیٹھ جاتا ورنہ انتظار میں آس پاس ٹہلتا رہتا۔ بنچ عام طور پر خالی ہی ہوتی اس کے بیٹھتے ہی چائے والا مگ بھجوا دیتا۔ چسکیاں لیتے ہوئے وہ اڈے میں ہونے والی سرگرمیوں کو دیکھتا رہتا۔ اسی دوران میں کوئی بس آجاتی تو وہ فوراً" مگ نیچے رکھ کر متوجہ ہو جاتا۔ جب ایک ایک کرکے سواریاں چلی جاتیں تو مگ اٹھالیتا اور ٹھنڈی چائے کو یوں گھونٹ گھونٹ پیتا جیسے اپنے آپ کو پی رہا ہو۔

یہ ورد برسوں کا تھا اور یونہی چلا جارہا تھا اسی دوران میں کئی موسم گرم اور سرد ہوئے۔ بارش ہوتی تو وہ دیوار کے ساتھ لگ جاتا۔ تیز بارش ہوتی تو وہ

کھوکھے کے چھجے کے نیچے آجاتا یا کبھی کبھار اندر بیٹھ جاتا لیکن اس دوران کوئی بس آجاتی تو دوڑ کر باہر نکل آتا اور جب تک آخری سواری اتر نہ جاتی وہیں کھڑا رہتا۔ اس آخری سواری کے انتظار میں وہ کئی بار بارشوں میں بھیگا سردی بھی لگی کئی کئی دن طبیعت خراب رہی لیکن ورد میں فرق نہ پڑا---- لیکن اس روز بارش اس طرح ٹوٹ کر برسی اور تیز ٹھنڈی ہوا ایسی تندی سے چلی کہ وہ اپنے وجود کی بے سروسامانی کا بھرم نہ رکھ سکا۔ اس کے کانپتے وجود کے سامنے چائے کا مگ رکھتے ہوئے چائے والے کو یقین ہو گیا کہ اسے شدید ٹھنڈ لگ گئی ہے۔

اگلے دن اس کا یقین ثبوت کو پہنچ گیا۔ وہ اس شام اڈے میں نہیں آیا پھر کئی دن گزر گئے۔ چائے والے کو خالی بنچ کاٹنے کو دوڑتی اس کی وضع کا کوئی شخص دور سے دکھائی دیتا تو وہ لپک کر اس کی طرف دیکھتا۔ بارشیں رکنے کا نام نہ لیتیں جس صبح موسم کی پہلی دھوپ نے چہرہ دکھایا اس نے لڑکے سے کہا "شاید آج بابو آجائے۔"

اس شام وہ تو نہ آیا لیکن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ لاہور سے آنے والی ایک بس سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکلی اور سیدھی اس بنچ کی طرف آئی۔ چند لمحے اس کے سامنے گم سم کھڑی رہی۔ پھر نڈھال ہو کر اس پر گر سی پڑی۔ بس سے ایک نوجوان اٹیچی لئے نکلا اور بنچ کے پاس آکر کہنے لگا۔

"امی! کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ ارے آپ تو رو رہی ہیں۔"

عورت نے دوپٹے سے آنسو صاف کئے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"بیس برس پہلے ایسی ہی ایک شام میں یہاں سے لاہور گئی تھی۔"

وہ چپ ہو گئی---- جیسے کچھ یاد کر رہی ہو۔

"دو ہی دن کے لئے تو گئی تھی۔"

"پھر" بیٹے نے تجسس سے پوچھا۔

"ابو نے میری شادی کر دی--- جھٹ پٹ----- ایک ہفتے کے اندر اندر---- تمہارے ابو لندن جو جا رہے تھے۔" پھر اداس رندھے ہوئے لہجے میں بولی "بیس برس بیت گئے لیکن یہ بنچ یہیں پڑی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بیٹے سے بولی۔ "چلو"

---- اور یہاں سے صرف دو فرلانگ دور اسی سڑک کے بائیں طرف والے قبرستان میں ایک تازہ قبر پر پڑے ہوئے پھول ہوا کے زور سے پتی پتی ہو کر دوسری قبروں پر بکھر رہے تھے۔

دھند

دھند دبے پاؤں زینہ زینہ اس طرح اتری کہ شہر کا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ گہری ہوتی سیاہ مائل دھند بازاروں، گلیوں میں پھیلتی ہوئی عمارتوں کی دہلیزوں تک آن پہنچی، تیسری منزل پر، دفتر کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اسے لگا نیچے کوئی سیاہ مائل سیال سی شے دیواروں سے ٹکراتی ہوئی گلیوں اور بازاروں میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے محسوس ہوا جیسے رات کا بند ٹوٹ گیا ہے اور تاریکی دریا کی طرف اُمڈی چلی آ رہی ہے۔ تیسری منزل سے نیچے جلتی بجھتی روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی موم بتیاں سی لگ رہی تھیں، اور ان کے درمیان کہیں مدھم سا ٹریفک کا شور تو سنائی دیتا تھا لیکن حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ شیشے سے منہ جوڑے نیچے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، سانس کے دھوئیں سے شیشہ اور اندھا ہو گیا اور نیچے ٹمٹماتی روشنیاں بجھنے سی لگیں۔ ابھی تھوڑا سا کام باقی تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر کمرے پر ڈالی۔ اس کے ساتھی ایک ایک کر کے جا چکے تھے، اکیلا چپڑاسی دراوازے کے قریب پڑے بنچ پر اونگھ رہا تھا۔ اس نے سامنے پڑی فائل کھولی اور نوٹ لکھنے لگا، لیکن دو چار سطروں کے بعد یوں لگا جیسے لفظ کترا سے رہے ہیں، قریب آتے ہیں، لیکن قلم کی نوک تک پہنچتے پہنچتے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں، کئی دنوں سے یوں ہی ہو رہا تھا۔ اسے لگتا چیزیں اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں، فضا میں کوئی ایسی بات تھی جسے وہ محسوس تو کر سکتا تھا لیکن خود اسے بھی معلوم نہ ہوتا کہ یہ کیا ہے۔ ایک اجنبیت سی تھی جو کسی نامعلوم ان دیکھے خوف میں بدل رہی تھی۔ دفتر کے سہمے ہوئے ماحول سے نکل کر گھر کی طرف جاتے ہوئے ہجوم میں ایک ویرانی کا احساس ہوتا۔ لگتا لوگ تیز تیز چل رہے ہیں، لیکن شاید چل نہیں رہے۔ قدم تو اٹھ رہے ہیں لیکن فاصلہ

طے نہیں ہو رہا۔ ہر کوئی دوسرے کو ڈری ہوئی نظر سے دیکھتا۔ کان کسی آواز کو سننے کے منتظر، کس آواز کو، یہ معلوم نہیں۔ بظاہر تو دوڑ لگی ہوئی تھی تیز رفتاری کی دوڑ، لیکن سفر تھکے قدموں کا، جو کسی دہلیز پر جا رکتے، اپنی دہلیز پر پہنچ کر کبھی جو سکون ملتا تھا وہ بھی کبھی کا جاتا رہا تھا۔ اب تو گھر میں ایک عجب طرح کی گھٹن اور تنگی داماں کا احساس ہوتا۔ جی چاہتا قفس کی تیلیاں توڑ کر کبھی فضا میں اڑاری ماری جائے۔ تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے کے لطف اور ذائقہ کی تمنا------ لیکن قفس کے باہر بھی قفس ہی تھا اور اندر کی گھٹن اور تنگی داماں باہر بھی تھی۔ کبھی لمحے ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ ان میں چھپے زمانوں کے دریچے پلک جھپکنے میں تلاش ہو جاتے تھے۔ ایک دریچے کو کھول کر چپکے سے دوسرے دریچے میں سے ہوتے ہوئے کسی دوسرے زمانے میں داخل ہو کر سب کچھ بھول جاتا تھا، لیکن اب لمحے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں تھے، لگتا تھا ان کے درمیان کئی کئی شگاف پڑ گئے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے جو ایک طمانیت ہوتی تھی وہ بھی جاتی رہی تھی اور اب پیچھے ایک چٹیل بنجر میدان دکھائی دیتا تھا جس میں اترنے کے خیال ہی سے خوف آتا، آگے دھند تھی، بس ایک درمیان کا کمزور سا لمحہ تھا جس پر پاؤں ٹکانے کی کوشش میں مسلسل ڈولنا------ اس نے فائل بند کر دی اور کرسی کی پشت سے سر لگا کر لمبا سا سانس لیا۔

"گھر چلنا چاہئے-----" خیال آیا، لیکن دھند------؟

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ دھند کی سطح آہستہ آہستہ اونچی ہو رہی تھی۔ ٹمٹماتی روشنیاں اور ٹریفک کا شور اس کی تہہ میں نیچے دور نیچے کہیں کلبلا سا رہا تھا۔ بس ایک سیاہ مائل چادر سی تھی جو ساری عمارتوں پر پھیل رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے پھر فائل کھولی۔ صبح اس فائل پر دستخط ہونا تھے اور----- اس کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا، اس سارے کام کا معاوضہ تو پیشگی مل گیا تھا۔ اس نے دفتر سے نکل کر مارکیٹ جانا تھا۔ بچوں اور بیوی کے لئے چیزیں خریدنا تھیں لیکن یہ دھند---- باہر دھند، اور اندر لفظ روٹھ کر منہ موڑے کھڑے تھے اور فائل میں بے معنی تین سطریں------ اس نے قلم نیچے رکھ دیا۔ صبح جلدی آنا پڑے گا،

ورنہ' ہاتھ پھر جیب کی طرف گیا۔ یقیناً صبح جلدی ہی آنا پڑے گا۔

نیچے اترتے ہوئے' اس نے ذہن میں ان چیزوں کی فہرست بنائی جو گھر لیجانی تھیں۔ دہلیز پر دھند اسے اپنی بغل میں لینے کے لئے موجود تھی۔ بس سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے لگا وہ بھی دھند کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ فٹ پاتھ پر لوگ سایوں کی طرح لگ رہے تھے۔ دور سے آتی بس ایک ٹمٹاتی روشنی سی لگتی اور پھر انجن کا شور اس کے وجود کا احساس کراتا۔ نہ ان کے نمبر پڑھے جاسکتے تھے' نہ بورڈ نظر آتے تھے۔ بس ایک قطار سی تھی جو بس کے رکنے پر اپنی جگہ سے حرکت کرتی اور دروازے میں سے گزر کر اندر داخل ہوتی۔ وہ بھی اپنی باری پر بس میں داخل ہوگیا اور قطار کے دباؤ کے ساتھ کھسکتا کسی سیٹ تک پہنچ گیا۔ بس چل پڑی۔ باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سنسناتی' ٹمٹماتی روشنیاں ایک دوسرے کے قریب سے گزر رہی تھیں اور ان کے درمیان کہیں بہت سے لوگ تھے' سہمے سہمے' کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ بس کہیں رکتی' قطار کا ایک دباؤ' دروازہ کھلتا کچھ نیچے اترتے' اور کچھ اوپر چڑھتے اور بس پھر رینگنے لگتی۔ رفتار تو اب یہی تھی۔ لگتا تھا سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے لیکن شاید چل بھی رہا ہے کہ اترنے چڑھنے کا سلسلہ جاری تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بس کہاں ہے اور کہاں سے گزر رہی ہے لیکن کچھ دکھائی نہ پڑتا۔ پھر ایک دباؤ سا اس کے پشت سے آیا اور اسے دھکیلتا ہوا دروازے تک لے آیا اور اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ کب فٹ پاتھ پر پہنچا۔ بس آگے رینگ گئی۔ دھند میں لپٹی مارکیٹ بچوں کے کھلونے کی طرح لگ رہی تھی۔ دروازے کے باہر دھند تھی اور اندر تیز روشنیوں میں چمکتی چیزیں۔

دو بڑے بڑے پیکٹ اٹھائے جب وہ باہر نکلا تو دھند میں ایک چپچپاہٹ' سی آگئی تھی یوں لگ رہا تھا کہ دھند اپنی لمبی زبان نکال کر چہروں کو چاٹ رہی ہے۔ ایک لمحے کے دریچے کو کھول کر دوسرے لمحے میں جانے کا دروازے بند ہوگیا تھا' پاؤں کے نیچے بھی دھند تھی اس لئے پاؤں بار بار اکھڑ رہے تھے۔ بازاروں کے نام اور گلیوں کے نمبر ایک دوسرے میں مل گئے تھے۔ بس ایک خیال سا تھا کہ دائیں

سے اتنا آگے جا کر بائیں مڑنا ہے اور بائیں سے اتنا آگے جا کر دائیں ہونا ہے۔ پھر کسی جگہ دائیں بائیں کا فرق بھی مٹ گیا۔ دھند میں سب ایک ہوگیا۔ ڈگمگاتے قدموں سے چلتے جانا۔ دھند اور سردی کی تہہ دار لہروں میں آنکھیں پھاڑ کر یا شاید نیم سوئے ذہن سے گن کر گھر کے نمبر تک پہنچنے کی خواہش۔ ایک اتھاہ اندھیرا------ لمحے شاید صدیوں میں بدل گئے۔

کال بیل پر دروازہ کھلا تو وہ دوڑ کر اندر داخل ہوا۔ دونوں پیکٹ بیوی کو دیتے ہوئے اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ گھر کی نیم گرم فضا میں لمحہ بھر کے لئے سکون سا ملا۔ بچے شاید سو گئے تھے۔ کھانا کھا کر کچھ دیر پڑھنے کی عادت تھی لیکن باہر پھیلی دھند نے جو اب دروازے اور کھڑکیوں پر دستکیں دے رہی تھی، اسے ڈرا سا دیا۔ وہ کپڑے بدل کر بستر میں گھس گیا۔ گرم جسم کی رفاقت نے سکون سا دیا۔ ایک طمانیت اور سرشاری کے احساس میں گرم گداز جسم کو لپٹاتے ہوئے دفعتاً" احساس ہوا کہ یہ اس کا گھر نہیں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور لحاف ہٹا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ نہیں یہ تو اس کا کمرہ نہیں۔ یہ بستر، یہ عورت----- اس نے اٹھنا چاہا لیکن دھند اب کھڑکیوں اور روشندانوں سے رینگتی ہوئی پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ سب کچھ بے شناخت ہوا جا رہا تھا۔ کمرہ، بستر اور کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ذہن کے کسی گوشے میں کچھ دھندلی سی تصویریں ابھریں، اس کا کمرہ، بستر، بیوی اور اس کے ساتھ------ اس نے اٹھنا چاہا لیکن دھند نے اسے دبا کر دوبارہ بستر میں دھکیل دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے لحاف اوپر کھینچ لیا۔

دھند گہری ہو جائے تو چیزوں کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ تو ہو ہی جاتا ہے۔!

خواب راستہ

یہ سڑک جو شام ہوتے ہی سنسان ہو جاتی ہے' اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ وہ سرِ شام ہی وہاں آ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا' نظریں سڑک پر جمائے یوں چلتا ہے جیسے کسی کھوئی ہوئی شے کو تلاش کر رہا ہو۔ اندھیرے کی نرم پھوار رفتہ رفتہ سڑک اور اس کے دو رویہ درختوں پر گہری ہونے لگتی ہے۔ گدگداتی تنہائی اس کے ساتھ ساتھ چلتے سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

رات گئے جب وہ گھر لوٹتا ہے تو رفتار میں تھکاوٹ آ چکی ہوتی ہے۔ ڈھلکے شانوں اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہ اندر آتا ہے اور خاموشی سے میز پر رکھے کھانے کے سامنے بیٹھ جاتا ہے اس کی بیوی سونے سے پہلے اس کا کھانا میز پر رکھ دیتی ہے۔ کھانا کھا کر وہ خاموشی سے بستر پر آتا ہے۔ بیوی گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ چپ چاپ اپنے حصے کے بستر پر لیٹ جاتا ہے۔

"افسوس! آج بھی ان کا کچھ سراغ نہیں ملا" وہ اپنے آپ سے کہتا ہے۔" جانے وہ اب کہاں ہے---- شاید---- جملہ پورا کرتے ہوئے خوف کی ٹھنڈی لہر پورے بدن میں دوڑ جاتی ہے۔

"شاید-----"

اسے یاد آتا ہے کہ برسوں پہلے اسی سڑک پر دو حادثے ہوئے تھے۔ پہلا حادثہ درختوں کے اس جھنڈ سے ذرا ادھر ہوا تھا جہاں سے سڑک ایک دم بائیں طرف مڑ جاتی ہے۔ وہ اپنی دھن میں گاڑی چلا رہا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر وہ تھی اور دونوں آنے والے دنوں کی سنہری خوابوں کی تعبیریں تلاش کر رہے تھے کہ دفعتاً" کتے کا ایک چھوٹا سا پلا ایک طرف سے دوڑتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس نے

بریک لگائی ----- گاڑی رکتے رکتے کتا نیچے آگیا۔ اس کی چیخ سے سنہری دنوں کے سارے سپنے بکھر گئے۔ وہ تیزی سے نیچے اترا کتا اگلے پہیے کے نیچے دبا پڑا تھا اور اس کے منہ سے تازہ گرم لہو کا فوارہ سا نکل کر سڑک پر پھیل گیا تھا۔

وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"اب چلو بھی ----" وہ بولی ---- "جو ہونا تھا سو ہو گیا"

وہ بے دلی سے گاڑی میں آیا اور پچھلے شیشے میں سے اس وقت تک سڑک پر پڑے کتے کو دیکھتا رہا جب تک وہ دکھائی دیا۔ گاڑی جھنڈ کے قریب سے بائیں طرف مڑ گئی تو بھی اس کی اداسی دور نہ ہوئی۔

اس کی حالت دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ---- "تم تو بہت ہی بزدل ہو ---- اور پھر تم نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا"

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر بولا ---- "کسی اور کے سامنے آ جاتا' میری گاڑی کے سامنے ہی کیوں آیا؟"

"چلو چھوڑو بھی" وہ بولی "موڈ خراب نہ کرو"

اس نے کندھے اچکائے لیکن کندھوں پر بیٹھی اداسی نیچے نہ اتری ہلکہ اس کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا۔ گھر تک یہی حالت رہی۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی یوں ہی لگا جیسے میز پر کتے کی لاش پڑی ہے اور اسی کے منہ سے ابلتا سرخ رنگ کا فوارہ سارے برتنوں پر گر رہا ہے۔ اس رات کتا اس کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ کبھی اس کے لحاف میں گھس جاتا اور لگتا اس کے منہ سے نکلتا گرم فوارہ ٹانگوں پر گر رہا ہے۔ وہ گھبرا کر جلدی سے لحاف الٹتا۔ کبھی لگتا وہ اس کے سینہ پر چڑھ گیا ہے' کبھی سرہانے آ بیٹھا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے اس جگہ پہنچا جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔ سڑک بالکل صاف تھی۔ نہ کوئی دھبہ نہ کوئی بے جان جسم' آس پاس دیکھا کہ شاید کسی نے اسے اٹھا کر سڑک کنارے پھینک دیا ہو۔ لیکن آس پاس کیا پوری سڑک کے دونوں طرف کچھ نہ تھا۔ ایک سکون سا ملا کہ شاید کل کا حادثہ ایک وہمہ ہی ہو۔ یہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہ آیا ہو' لیکن دوسرے ہی لمحے کتے کی چیخ اور اس کے منہ سے

نکلتا سرخ فوارہ آنکھوں کے سامنے پھیل گیا۔

کئی دنوں تک یہی رہا کہ وہ وہاں آتا اور سڑک کے دونوں کناروں پر اسے تلاش کرتا۔ پھر یہ خیال آتا کہ شاید یہ حادثہ پیش ہی نہ آیا ہو' وہ اپنے آپ سے سوال کرتا کبھی جواب ہاں میں ہوتا کبھی نہ میں' کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ اصل بات کیا ہے۔ اس وقت سڑک خالی تھی' کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا' بس ایک وہی تھی جو بتا سکتی تھی کہ واقعی یہ حادثہ ہوا تھا یا نہیں' تو پھر اسی سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتا----- ایک دن وہ بھی اچانک اس کی گاڑی سے اتر کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔

اس واقعہ کے بارے میں بھی اسے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں' بس یہ خیال سا آتا ہے کہ وہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی' جب گاڑی درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچی جہاں سے سڑک ایک دم بائیں کو مڑ جاتی ہے تو گاڑی بہت آہستہ ہو گئی۔ اس نے پلک جھپکنے میں دروازہ کھولا اور دوڑتی ہوئی درختوں میں گم ہو گئی۔ چند لمحوں تک اسے کچھ سمجھ نہ آیا' پھر وہ گاڑی ایک طرف کر کے نیچے آیا اور درختوں کے جھنڈ میں اسے تلاش کرنے لگا۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا درختوں کی دو تین گھنی قطاروں کے بعد ریلوے لائن تھی جس کے دوسرے طرف میلوں ویران علاقہ تھا۔ اس نے چاہا کہ اسے آواز دے لیکن دفعتاً" اسے احساس ہوا کہ وہ اس کا نام بھول گیا ہے۔ آواز دینے کے لئے اس کا کھلا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ بھاگ کر سڑک پر آیا کہ شاید وہ کسی اور طرف سے ہو کر گاڑی تک پہنچ گئی ہو لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ وہ دوڑ کر دوبارہ درختوں میں سے ہوتا ریلوے لائن تک آیا جس کے دوسری طرف میلوں پھیلا ویران علاقہ تھا۔

وہ اسے کہاں تلاش کرے---- پکارے' لیکن اس کا نام یاد نہیں آ رہا' کس سے پوچھے----- لیکن اس کا حلیہ' اسے احساس ہوا کہ اس کے چہرے کے سارے خطوط گڈمڈ ہو گئے ہیں' کوئی لائن واضح نہیں' اس کا چہرہ---- اس کا چہرہ کیسا تھا' وہ کسی سے پوچھے تو کیا پوچھے؟

رات بھر یہی خیال آیا کہ وہ درختوں کے جھنڈ میں کہیں چھپی بیٹھی ہے' پھر

یوں لگا جیسے درختوں نے اسے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ وہاں آیا اور ایک ایک درخت کے پیچھے اسے تلاش کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا' خیال آیا کیا معلوم اس دوران وہاں کوئی ٹرین آ گئی ہو اور وہ چلتی ٹرین میں سوار ہو گئی ہو مگر کیسے----؟ کیا معلوم ٹرین وہاں لمحہ بھر کو رک گئی ہو اور وہ----- یا یہ کہ وہ لائن عبور کر کے ویران علاقے میں اتر گئی ہو' لیکن کیوں؟

اس کیوں کا جواب اسے برسوں سے نہیں ملا۔ اس دوران کئی ٹھنڈے میٹھے موسم آئے اور گزر گئے۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپی ریلوے لائن کے اس پار کا ویران علاقہ مہکتی بستی میں تبدیل ہو گیا۔ اب یہ سڑک بھی ویران نہیں رہی۔ سارا دن اس پر ٹریفک کا شور لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں تھمتا' لیکن شام ہوتے ہی اس کی رونق ماند پڑ جاتی ہے اور پرانی شباہتیں کہیں کہیں سے ابھر آتی ہیں۔ وہ روز یہاں آتا ہے اور ٹھیک اس جگہ جہاں کبھی کتا اس کی گاڑی کے نیچے آگیا تھا گاڑی آہستہ کرتا ہے اور پھر اسے ایک طرف کھڑی کر کے سڑک کے دونوں کناروں پر کچھ تلاش کرتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی راہ گیر اسے یوں تلاش میں مصروف دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھک جائے تو وہ پوچھتا ہے---- "آپ نے یہاں کہیں کوئی زخمی کتا تو نہیں دیکھا" پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کہتا ہے---- "نہیں آپ نے نہیں دیکھا ہو گا"

خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں یہ حادثہ ہوا بھی ہے یا نہیں' شاید یہ اس کا وہمہ ہی ہو۔ وہ سر ہلاتا پیدال ہی درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑتا ہے ان میں سے ہوتا ہوا ریل کی پٹڑی تک آتا ہے۔ دوسری طرف مہکتی بستی کی روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی ہیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر یوں دیکھتا ہے جیسے دور کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

"جانے وہ کہاں چلی گئی ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا ہے---- "یہیں تو اتری تھی" اس کا نام سوچتا ہے اس کے چہرے کے دھندلے دھندلے نقوش کو اکٹھا کرتا واپس گاڑی تک آتا ہے اور خاموشی سے واپس چل پڑتا ہے۔

گھر پہنچتے رات گہری ہو جاتی ہے۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے چپ چاپ

اندر آتا ہے۔ بیوی گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ وہ اپنے حصے کے آدھے بستر پر گر پڑتا ہے۔

سونے سے پہلے اسے خیال آتا ہے جانے وہ کہاں چلی گئی ہے' پھر کتے کی آخری چیخ اور اس کے منہ سے ابھرتا سرخ فوارہ----- آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔

یہ اس کا روز کا معمول ہے۔ اس سڑک سے گزرنے والے اس کے عادی ہو چکے ہیں اور روز دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے سڑک کے دونوں کناروں پر کچھ تلاش کرتا ہے' پھر جھنڈ میں سے ہوتا ہوا پڑی تک آتا ہے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک دوسری طرف کی بستی کو دیکھتا رہتا ہے۔ بس کبھی کبھار کسی سے پوچھ لیتا ہے----- "تم نے اسے دیکھا تو نہیں"

"وہ جو برسوں پہلے یہاں اتری تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی۔"

پھر اپنے آپ سے کہتا---- "اسے کیا خبر؟"

لیکن جاننے والے بتاتے ہیں کہ یہ سب اس کا وہمہ ہے برسوں پہلے تو اس کے پاس گاڑی کیا سائیکل تک نہیں تھی۔

دھند میں سے نکلتا دن

شام کی نیم تاریکی میں دور سے آتے گھوڑوں کی چاپ اور غبار نے وقت کی گنتی کو الٹ پلٹ کر دیا۔ ایک پراسرار چاپ نے صدیوں کے سوئے رشتوں کو جگا دیا' دھند میں سے طلوع ہوتے منظر سے ایک چھوٹا سا کارواں ابھرا' چیزیں آہستہ آہستہ واضح ہونے لگیں۔ تھکے ہوئے گھوڑوں پر مسافت زدہ چہروں والے سپاہیوں کے درمیاں جھولتی ہوئی ایک عماری' اس کے مخملی شقہ کو تھامے حنائی انگلیاں اور اس کے پیچھے سے جھانکتی مخمور آنکھیں'

"ہم رات یہیں گزاریں گے۔" قریب پہنچ کر کماندار نے کہا۔

"لیکن یہاں تو"

"ملکہ عالیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں" اس نے بات کاٹ دی۔ "وہ اور سفر نہیں کر سکتیں۔"

چوکی کا چھوٹا سا کمرہ فوراً" خالی کر دیا گیا۔ سواری قریب آگئی۔ پردے ہٹے' غاشیہ بردار نے پائدان ساتھ لگایا۔ مخملی پاؤں باہر آیا' پھر دوسرا---- شام کی نیم تاریکی ہی میں چودھویں کا چاند نکل آیا۔ ایک شان استغنا سے کوٹھری پر نظر ڈالی گئی' پھر گھنٹیاں بج اٹھیں---- "ہم یہیں باہر قیام کریں گے"

چھوٹی سی چوکی کے چھوٹے سے اہل کار نے ایک تخت نما چوکی برآمدے میں بچھا دی۔ غاشیہ بردار عماری سے مخملی فرش اٹھا لایا۔

چوکی پر بیٹھتے ہوئے ایک عجیب بے پرواہی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے مقنع کھولا۔ زلفیں سارے عالم میں بکھر گئیں اور چاند کے گرد گھرے بادل تیرنے لگے۔ اس کا سب کچھ تیز بارش میں بہہ گیا۔

کماندار کو حکم ہوا---- "تم لوگ بھی اب آرام کرو۔"

سپاہی اور کماندار گھوڑوں کو کھول کر نیم دائرے میں بکھر گئے۔
وہ اسی طرح دم بخود، لٹا پٹا، وہیں کھڑا رہا------
نیم آنکھوں سے اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا گیا---- "اتنی دیر سے ایسے ہی کھڑے ہو، پتھر تو نہیں ہو گئے۔"
اس نے گھبرا کر اپنے آپ کو ہلایا،
گھنٹیاں بج اٹھیں---- وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔
وہ رات بیتی نہیں، بس ٹھہر گئی۔ صدیوں پر پھیل گئی۔ لگا زمانے بیت گئے ہیں اور شناسائیاں رشتوں میں بدل گئیں جو بدنوں سے نکل کر روحوں میں اتر گئے ہیں۔
صبح جب کارواں چلنے لگا تو سوار ہوتے ہوئے اس پر بے نیازی کی نظر پڑی، وہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ اس بے نیازی میں ایک لگاؤ، ایک پیغام تھا، اس خاموش پیغام نے اس کے پاؤں کھول دیئے اور وہ سنگلاخ راستے پر جاتے کارواں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
کاروان مسافت کی دھند سمیٹتا فصیل شہر کے بڑے دروازے پر لمحہ بھر کو رکا۔ مخملی شقہ ذرا سا کھلا۔ دو مخمور آنکھوں نے اس پر ایک عجیب نظر ڈالی۔ حنائی انگلیوں سے چھوٹا معطر رومال اڑتا ہوا اس کے پاؤں سے جا لگا۔ اگلے لمحے کارواں فصیل کے اندر گم ہو گیا۔
اس نے جھک کر رومال اٹھایا۔ اس کا معطر پیغام اس کے سارے وجود میں اتر گیا۔ رومال کو سینے سے لگائے وہ وہیں فصیل کے ساتھ بیٹھ گیا۔
شاید دو دن بعد یا دو صدیوں بعد اسے شاہی قیام گاہ میں طلب کیا گیا۔
ایک رعب دار گونجتی آواز نے پوچھا------ "چوکی چھوڑ کر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
اس نے کوئی جواب نہ دیا----- جواب تھا ہی نہیں۔
رعب دار آواز کے پیچھے مخملی پردوں کے پیچھے ہلکا سا ارتعاش ہوا یوں لگا جیسے اس کے پیچھے چھپی مخمور آنکھوں نے کچھ کہا ہے۔ حنائی انگلیاں بے تابی سے

پردے پر مچلتی رہیں۔

"جواب دو-----"

"میں--------" وہ کچھ نہ بول سکا۔

کچھ کہا گیا---- لیکن وہ سن نہ سکا۔

سپاہی اسے نرغے میں لے کر باہر آئے' ایک طویل دالان سے گزر کر قلعہ کے دوسرے حصے کی طرف بڑھے۔ پھر سیلن زدہ سیڑھیاں اتر کر وہ ایک نیم تاریک راہداری میں داخل ہوئے ایک اندھیری کوٹھری کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا گیا۔

کوٹھری کا دروازہ بند ہوتے ہی سیلن' بو اور تاریکی سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور قمیص کے نیچے سینے سے لگا معطر رومال کھسک کر نیچے جا گرا۔

صدیاں الٹ پلٹ ہو گئیں۔

شام کی اس نیم تاریکی میں دور سے آتی ویگنوں اور جیپوں کی آواز' ایک پراسرار چاپ اور انجانی سی خوشبو' انجانے ان دیکھے رشتوں کی خبر دیتی ہے۔ سرحد پار سے آنے والے مہاجر اپنی رجسٹریشن کے لئے رکتے ہیں اور پھر بل کھاتی سڑک سے ہوتے شہر کی طرف چلے جاتے ہیں۔

وہ سر جھکائے رجسٹر پر اندراج چیک کر رہا ہے۔

"سر-----"

سر اٹھاتا ہے' اس کا نائب جانے کب سے کھڑا ہے۔

"کیا بات ہے دلاور خان؟"

"سر! یہ عورت آپ سے بات کرنا چاہتی ہے"

دلاور خان کے پیچھے کھڑی عورت اس کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ جاتی ہے۔ صدیوں کے فاصلے نقطے میں سمٹ جاتے ہیں' بھوک سے ستے ہوئے چہرے' پھٹے لباس اور ننگے پاؤں' ایک ہاتھ سے دروازے کے پٹ کا سہرا لئے' گود میں دودھ پیتے بچے کو سنبھالے وہ التجا بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔

"صاحب جی-----" اس کی آواز میں وہی ترنم ہے، لیکن مخمور آنکھوں میں وہ شان بے نیازی نہیں، بھوک اور مجبوری کا اداس پن ہے۔

"صاحب جی----- مجھے آج رات یہاں رکنے دیں، میرا بچہ ٹھیک نہیں۔ اس حالت میں اسے لے کر میں رات کو سفر نہیں کر سکتی، صاحب جی-----"

وہ اس کے پیچھے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ نہ کماندار ہے، نہ سپاہی۔

وقت بھی کیا شئے ہے۔

"صاحب جی----- راستے میں ہمارے قافلے پر حملہ ہوا۔ میرا شوہر بھی-----" اس کی آواز رندھ گئی۔

"صاحب جی! میرا بچہ بیمار ہے---- مجھے رات بھر----"

سرحدی چوکی کے برآمدے میں نیم تاریکی میں، وہ ایک کونے میں زمین پر سمٹی بیٹھی ہے۔ بچہ اب بھی اس کی گود میں آرام کر رہا ہے۔ سپاہی نے ایک مگ میں چائے اور ڈبل روٹی کے دو تین سلائس اس کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ وہ سر جھکائے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے بچے کو دیکھتی ہے، پھر ڈبل روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر چائے کا مگ اٹھا لیتی ہے۔

وہ کچھ فاصلے پر پتھر بنا، اسے دیکھے جا رہا ہے، بس دیکھے ہی جا رہا ہے۔

کہتے ہیں ملکہ نے رات کو اپنے شوہر سے وعدہ لیا تھا کہ قیدی کو معاف کر کے دوبارہ اپنی چوکی پر بھیج دیا جائے۔ صبح کماندار کو حکم دیا گیا کہ جاتے ہوئے قیدی کو رہا کر دیا جائے، لیکن تخت دلی پر قبضہ کرنے کے نشے نے سارے لشکر کو ایک عجیب بے قراری میں ڈال رکھا تھا۔ کماندار قلعہ سے رخصت ہوتے ہوئے شاہی حکم بھول گیا۔

صدیاں بیت گئیں، کسی کو خیال ہی نہ آیا کہ کوٹھری کی سیلن، بو اور تاریکی میں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس نے کیسے جان دی!

پس عکس

اپنے طور پر وہ مطمئن تھا کہ اس کام سے بہتوں کا بھلا ہو گا' لیکن ڈر اپنی جگہ تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فوری موت یا لمبی سزا۔ بریف کیس اسے دیتے ہوئے بتا دیا گیا تھا کہ دو مرحلے بہت مشکل ہیں' ایک جب وہ ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہو گا اور دوسرے جب بس بارڈر کراس کرنے سے پہلے چیکنگ کے لئے رکے گی۔ اس نے کاغذات کو احتیاط سے بریف کیس کی تہہ میں پلاسٹک سے جما کر اوپر کپڑوں کے دو جوڑے اس طرح رکھ دیئے کہ سارا بریف کیس خالی کئے بغیر کاغذات نظر نہیں آ سکتے تھے۔

بس سٹاپ پر کوئی خاص رش نہیں تھا۔ بس تیار ہی تھی۔ ٹکٹ گھر کے سامنے دو تین شخص موجود تھے وہ بھی ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کی باری پہ ٹکٹ مل گیا۔ ٹکٹ لے کر جب وہ بس کی طرف چلا تو احساس ہوا کہ بہت سی پر اسرار آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے پاؤں ڈگمگائے لیکن پھر فوراً" ہی سنبھل گیا اور بس کنڈیکٹر کو ٹکٹ دے کر اندر چلا گیا۔ اس کی سیٹ بائیں طرف کے آدھے حصے میں تھی۔ اس نے بریف کیس آہستہ سے اوپر ریلنگ پر ٹکا دیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کا ایک ساتھی بھی ٹکٹ لے کر اندر گیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اس سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اشارے سے ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس کیا۔ بس چلنے سے پہلے دو بار چیکنگ ہوئی۔ پہلی بار ایک ادھیڑ عمر دو ساتھیوں کے ساتھ اندر آیا۔ انہوں نے ایک ایک سیٹ کے پاس کھڑے ہو کر نیچے اوپر کا جائزہ لیا۔ ایک آدھ مسافر سے سوال بھی پوچھا۔ ایک آدھ سامان کے پیکٹ کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور نیچے اتر گئے۔ دوسری بار بس چلنے سے چند لمحے پہلے ایک پھرتیلا سا جوان جس کی آنکھیں

بھی ناچ رہی تھیں' اندر آیا۔ وہ گیٹ کے پاس ہی کھڑا ایک ایک چہرے کو دیکھتا رہا' پھر اس کی نظریں سامان کی ریلنگ پر گھومتی رہیں۔ اس کے نیچے اترتے ہی کنڈیکٹر نے دروازہ بند کر دیا اور بس رینگنے لگی۔

اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بھی نہ آیا۔ اس نے بازو لمبا کر کے سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور ایک لمبا سانس لیا۔ ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ لیکن مرحلہ طے نہیں ہوا۔ بس کی رفتار کے تیز اور کم ہونے کے ساتھ خوف نے کئی بار اس کے بدن پر تیز اور ہلکی دستکیں دی۔ اسے خیال آیا اتنی آسانی سے یہ مرحلہ طے نہیں ہو سکتا تھا' یقیناً یہ کوئی چال ہے' ممکن ہے وہ اسی بس میں موجود ہوں اور اسے کسی خاص جگہ یا موقع پر پکڑنا چاہتے ہوں۔ اس نے کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا' دو تیز چبھتی ہوئی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے متوجہ پا کر وہ سیدھا ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تو کیا وہ میرا جائزہ لے رہا تھا' مگر کیوں؟ اس نے چور نظروں سے اوپر بریف کیس کی طرف دیکھا۔ بس کی رفتار ذرا سا دھیمی ہوئی۔ وہ چونک گیا' تو کیا یہیں' اس نے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا' لیکن وہ تیز چبھتی آنکھیں اب باہر دیکھ رہی تھیں' بس اگلے لمحے تیز ہو گئی' اس نے لمبا سانس لیا اور پسینے میں لتھڑے ماتھے کو رومال سے صاف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بریک کے جھٹکے اور تیز آواز نے اسے بوکھلا کر جگا دیا شاید وہ آ گئے ہیں---- شاید پیچھے پیچھے ہی آ رہے تھے یا پھر شاید یہاں تاک لگائے بیٹھے ہوں۔ بس تقریباً" رک گئی' لیکن نہ دروازہ کھلا نہ کنڈیکٹر اپنی جگہ سے ہلا۔ اس نے اپنی سیٹ سے ذرا سا اٹھ کر دیکھا۔ سڑک پر ایک گائے اپنی دھن میں مست کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ منہ میں آیا ہوا سانس آہستہ آہستہ اپنی جگہ آنے لگا۔ بس پھر چل پڑی۔

تو کیا واقعی ان کو پتہ نہیں چلا؟ اس نے اپنے آپ پوچھا--- یہ کیسے ممکن ہے؟ اس سے پہلے اس طرح کی کوشش کئی بار ناکام ہو چکی ہے۔

اس کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ اس نے انہیں زبان سے تر کیا۔ آخری چوکی آنے میں اب کچھ ہی فاصلہ باقی تھا' بس اس کے بعد-----

جہنم یں گئی بھلائی۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا---- اب کچھ دیر بعد ہی سارا کھیل ختم ہو جائے گا' یقیناً وہاں وہ موجود ہوں گے۔

اس کے سارے وجود پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا---- ایک لمحے کے لئے خیال آیا۔ کھڑکی کھول کر بریف کیس کو باہر پھینک دے لیکن وہ بہت سے لوگ جن کے بھلے کے لئے----- اس نے سر جھٹکا---- جہنم میں گئے لوگ۔

خوف اس کے سارے وجود پر چھا گیا تھا اور رینگ رینگ کر اس کے اندر گرنے لگا۔ اسے لگا وہ پانی میں نہا گیا اور سارا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ سڑک پر تیزی سے پیچھے ہٹتے نشان نے چوکی کی آمد آمد کی خبری دی---- وہ کانپ گیا۔ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ بریف کیس کو اٹھا کر یا تو باہر پھینک دے یا پھر اگلی سیٹ پر بیٹھے ساتھی کی طرف کھسکا دے لیکن اس سے پہلے وہ اپنی جگہ سے اٹھتا' اچانک پچھلی سیٹوں سے ایک منحنی سے بدن والا شخص اس کی ساتھ والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اس کا آدھا اٹھا ہوا وجود سیٹ میں دھنس گیا۔ خشخشی داڑھی والے اس شخص نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا' ایک لمحے کے لئے سکون سا ہو گیا۔ اتنے میں بس چوکی کی حدود میں داخل ہو کر بیریئر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا۔ دو شخص اندر آئے اور ایک سیٹ کے پاس جا کر دیکھنے لگے۔ اس کے قریب پہنچ کر ایک شخص نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

اس میں کیا ہے؟

"کپڑے" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور بات ہوتی' اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا خشخشی داڑھی والا اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے دروازے کی طرف دوڑا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے لپکے اور تینوں بس سے اتر کر نیم تاریکی میں گم ہو گئے۔ کنڈیکٹر نے دروازہ بند کیا۔ بیریئر اوپر ہوا اور بس رینگتی ہوئی دوسری طرف آ گئی۔

اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ چند میل آگے نکل کر جب وہ چائے پینے

رکے تو اگلی سیٹوں پر بیٹھا اس کا ساتھی بھی اس کے پاس آ بیٹھا اور بولا--- "شکر ہے لیکن یار جب وہ تم سے بریف کیس کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو تم بری طرح گھبرا گئے تھے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ہاں" اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "اگر اس وقت ساتھ والی سیٹ والا اتنی تیزی سے نیچے نہ اترتا اور وہ اس کے پیچھے نہ بھاگتے تو بریف کیس کھل گیا تھا۔"

"ساتھ والی سیٹ والا۔" اس کے ساتھی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں ساتھ والی سیٹ والا' وہی خشخشی داڑھی والا تھوڑی دیر پہلے ہی تو پچھلی سیٹوں سے اٹھ کر آگے آیا تھا۔"

اس کے ساتھی نے اسے عجیب بے یقینی سے دیکھا۔ "لیکن تمہاری ساتھ والی سیٹ تو سارے رستے خالی رہی ہے۔"

اسے کچھ دیر اس کی بات سمجھ نہ آئی' پھر بولا---- "لیکن"

"لیکن کیا--- تمہارے ساتھ والی سیٹ تو سارے رستے خالی رہی ہے اور اب بھی خالی ہے۔"

"تو پھر----" وہ بڑبڑایا---- "وہ کون تھا؟"

"کون--- کون تھا" اس کے ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی-----" اس نے آہستگی سے کہا---

کچھ دیر سوچتا رہا پھر جیسے خود سے کہہ رہا ہو بولا---- "شاید وہ میں ہی تھا"

اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔

آئینہ گزیدہ

خوف باہر سے آئے تو اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی صورت تلاش کی جاسکتی ہے لیکن جب وہ اندر سے رینگ رینگ کر باہر نکلے تو اپنے آپ سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے، پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی ڈر کی سرمئی چادر میں لپٹا ہوا تھا، کبھی لگتا کوئی دبے پاؤں پیچھے آرہا ہے، کبھی آئینہ دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا کہ اس کے چہرے کے اندر سے کچھ عجب سے ڈروانے خدوخال ابھر رہے ہیں لیکن جونہی وہ چوکنا ہوتا، ابھرتا ہوا چہرہ اس کے چہرے کے اندر نیچے اتر جاتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کے وجود کے اندر کوئی ڈراؤنا سا وجود پرورش پا رہا ہے۔ شروع شروع میں شائد اس کا سائز بہت ہی ننھا سا تھا۔ کبھی کبھار کسی سے باتیں کرتے، ہنستے کھیلتے، وہ وجود کی گہرائیوں میں دور نیچے کہیں کلبلاتا، اور آپ ہی خاموش ہوجاتا، پھرنا محسوس طور پر اس کی حرکت کبھی تیز اور کبھی کئی کئی دن کے لئے ساکت ہوجاتی اور اسے بھول ہی جاتا کہ اس کے اندر کوئی شے کبھی کبھی کلبلاتی بھی ہے۔

لیکن اب ادھر پچھلے چند روز سے ایک عجب طرح کا خوف رس رس کر اس کے اندر سے نکل رہا تھا۔ اسے خیال آتا کہ کہیں میرے وجود میں کوئی دراڑ تو پیدا نہیں ہوگئی۔ یہ ہروقت کیا رستا رہتا ہے۔ وہ اپنے سارے بدن پر ہاتھ پھیرتا لیکن کہیں کوئی دراڑ نظر نہ آتی۔ تو پھر یہ کیا ہے؟

یہ کون کبھی کبھی میرے اندر انگڑائی لیتا ہے اور کنگھی کرتے، شیو کرتے یہ آئینہ میں؟ ایک لمحے کے لئے میرے چہرے کی بجائے یہ کس کا ڈراونا چہرہ ابھرتا ہے؟ یہ چہرہ آئینہ کے اندر ہے یا میرے چہرے کے اندر، عجب سے ڈرؤانے خدوخال والا یہ چہرہ لمحہ بھر کے لئے ابھرتا اور اس کے چونکتے اندر ڈوب جاتا، رات کو بھی کبھی کبھی بتی بند کرکے بستر کی طرف جاتے ہوئے اپنے پیچھے کسی چاپ کا

احساس ہوتا، وہ تیزی سے مڑتا، بس ایک سایہ سا محسوس تو ہوتا اور پھر کچھ بھی نظر نہ آتا، یہ کون میرا پیچھا کرتا ہے؟ باہر ہے یا میرے اندر، کوئی میرے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے یا باہر سے اندر داخل ہو کر مجھے قابو کرنا چاہتا ہے، کچھ سمجھ نہ آتا۔ کیا معلوم اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو رہی ہوں۔ تبدیلی کا یہ احساس تھا تو اندر سے، باہر سے ہوتا تو کوئی نہ کوئی ضرور ٹوکتا۔ اب کسی سے پوچھتے بھی جھجک آتی تھی۔ اور پوچھے بھی کیا۔ میری صورت تو تبدیل نہیں ہو رہی----- کوئی تبدیلی؟ ایسے ہی ذرا سی بھی، سننے والا ہنس ہی پڑتا، لیکن یہ اندر کیا شے تھی۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ ایک زور کی ابکائی لے کر اسے باہر اگل ڈالے، لیکن پھر لگتا کہ کیا معلوم وہ شے اندر سے نکلے ہی نہ۔ یا۔ نکل آئے تو حلق میں آن کر پھنس جائے۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے، خوف نے اس کے وجود پر ہولے سے دستک دی۔ یہ خوف ہی تو ہے جو اس کے اندر سے رس رس کر نکل رہا ہے۔

چاپ کبھی تیز ہوتی ہے کبھی مدھم، اور وہ جو پیچھے پیچھے چلا آتا ہے کبھی باہر ہوتا ہے کبھی اندر اور اندر تو ایک وسیع خلاء ہے، جس کی سرمئی دھند میں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں، رات کے پچھلے پہروں میں اس نے کئی بار اس خلاء میں اترنے کی کوشش کی لیکن زیادہ دور تک نہ جاسکا کہ وہاں بھی ایک انجانا ڈر ناکہ لگائے بیٹھا ہے، ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتا۔ ایک حد سے آگے جانے کی جرات تو اسے ساری زندگی کسی معاملے میں نہ ہوئی۔ اس کی آزادی تو اس ایک ان دیکھی رسی کی لمبائی تک محدود تھی جو اس کے اندر بہت اندر کسی نامعلوم کھونٹے سے بندھی ہوئی تھی۔ اور یہ خوف یہ نامعلوم سا ڈر شائد ہمیشہ ہی اس کے اندر کہیں نہ کہیں موجود رہا تھا، ایک تیرتے ہوئے بادل کی طرح جو اندر کے خلاء میں آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر آتا جاتا رہتا تھا، لیکن اب کچھ عرصہ سے جیسے یہ بادل ٹھہر گیا تھا اور اس نے دھیرے دھیرے ایک وجود کی صورت اختیار کرلی تھی، پہلے چھوٹا سا، پھر بڑا ہوتے ہوتے اس اس کے قد سے بھی نکلتا ہوا ایک ڈراؤنا وجود، جواب اکثر اس کے اندر سے نکل کر باہر آجاتا۔

شروع شروع میں اس کا احساس ایک نامعلوم نامحسوس چاپ کی صورت میں

ہوا' مڑ کر دیکھتا تو کچھ بھی نہ ہوتا' چند دنوں بعد اس وہم سے چھٹکارا پایا تو آئینہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے اس کے چہرے پر ایک بدہیت سے چہرے کے خدوخال ابھرتے' جیسے ایک پل کیلئے اس نے کوئی ماسک پہن لیا ہے' لیکن جونہی وہ چوکنا ہوتا' اس کا اپنا چہرہ آئینہ میں جھلملانے لگتا' پھر کچھ عرصے بعد یوں لگا جیسے کبھی کبھی اچانک اس کے وجود کو کرنٹ سا لگتا ہے' ایک نامحسوس کپکپاہٹ اس کے سارے وجود کو ہلا دیتی' جیسے دفعتہ کوئی جھٹکا لگا ہے۔ شروع شروع میں وہ خود کو یہی دلاسہ دیتا رہا کہ شائد بے خیالی میں اس کا ہاتھ کسی ایسی جگہ پر جا لگا ہے جہاں کرنٹ ہے' لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی شے کو چھوئے بغیر ہی اسے یہ جھٹکا لگا۔ اب اس نے سوچنا شروع کیا کہ اگر کسی شے کو چھوتے چھوتے مجھے یہ جھٹکا نہیں لگتا تو وہ کونسی شے یا منظر ہے جسے دیکھ کر اس کے اندر کوئی انگڑائی لیتا ہے۔ بہت دنوں تک بہت غور کر کے بھی اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ کیفیت اس پر کب اور کیوں طاری ہوتی ہے۔ چند دن کھانے پینے میں بھی احتیاط کی کہ شاید زیادہ کھانے کا خمار' یا زیادہ نیند کا نشہ اس کے بدن پر کوئی چٹکی لیتا ہو' پھر خیال آیا شاید اس کے مطالعے میں کوئی ایسا موضوع ہو جو اس کے تخیل میں سرسرا کر اس کے وجود میں اتر آتا ہو' پھر سوچا شائد اس کے ملنے جلنے والوں میں کوئی ایسا ہو جس کا اثر سائے کی طرح اس کے ساتھ لگ گیا ہو' پھر خیال آیا شائد سیر کرتے ہوئے شام کو وہ کسی ایسی جگہ سے گزرتا ہو جو بھاری ہو اور وہاں کوئی ایسا ان دیکھا وجود ہو جو اس کے اندر اترنے اور جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہو۔ لیکن بہت غور کرنے اور احتیاط کے باوجود وہ کسی وجہ تک نہ پہنچ سکا۔ آخر تھک کر اس نے اس حد تک سمجھوتہ کر لیا کہ اگر اس کے وجود کے آلنے میں اس کے علاوہ کوئی اور پرندہ بھی آن بسا تو کیا ہے' دونوں اپنے اپنے حصے کی جگہ بانٹ لیتے ہیں اور چپ چاپ' ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر' ایک دوسرے کی پرواز میں رکاوٹ ڈالے بغیر اپنی اپنی جئے جاتے ہیں' ایک کے دو ہو گئے تو پھر کیا ہے' آخر کل اسی طرح تو اجزاء میں بٹتا رہتا ہے' شائد کسی موقعہ یا مرحلہ پر وہ بھی ایک ہو جائیں یا ان میں سے ایک اسی آلنے کو چھوڑ دے' لیکن یہ اطمینان کچھ دیر ہی رہا' یہ جو چہرے کے اوپر ایک اور چہرہ ابھرنے لگتا ہے' اس کا کیا کرے'

یہ خوفناک ڈراؤنا چہرہ تو اسے کسی قیمت پر قبول نہیں۔ اس چہرے کو--- اس چہرے کو، سوچتے سوچتے اسے دفعتاً" خیال آیا، یہ چہرہ تو صرف اس وقت ابھرتا ہے جب وہ آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، تو--- تو، کیا اسے کسی نے کاٹ لیا ہے--- آئینہ گزیدہ------ وہ بڑبڑایا، اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کہ جس آئینہ کا وہ ڈسا ہوا تھا، وہ تو اس کا اپنا آپ تھا۔

سراب

شہر تو کئی شہروں کا ایک شہر تھا' اس لئے کسی ایک حصہ میں چلنے والی گولیوں کی تڑتڑ اور چیخیں دوسرے حصے میں سنائی نہیں دیتی تھیں' لیکن فضا میں خوف کی ایسی چپچپاہٹ تھی جو سسکیوں اور آہوں کو لمحوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتی تھی' اس لئے شہر کے کسی بھی حصے میں ابھرنے والی کراہ لمحہ بھر میں چاروں طرف پھیل جاتی' فضا میں چھائے خوف نے چوکنا تو کر ہی دیا تھا اس لئے کوئی بھی غیر معمولی حرکت یا بات فوراً" اپنی طرف متوجہ کر لیتی اور اس عورت کی تو ساری حرکتیں ہی مشکوک تھیں' ایک تو اس کا بار بار کبھی چوکنا ہو کر اور کبھی کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لینا اور دوسرے چادر میں لپٹی ہوئی کوئی شے جسے وہ مضبوطی سے سینے سے چمٹائے ہوئے تھی' یہی لگ رہا تھا کہ ابھی ایک لمحے میں چادر ہٹا کر کوئی ہتھیار باہر نکلے گا اور پھر تڑ تڑ تڑ' یا یہ بھی کہ اس چادر میں کوئی دھماکا کرنے والی شے ہو جسے کہیں چھپانے کے لئے وہ مناسب موقع کی تلاش میں ہو' یہ بار بار کن انکھیوں سے اور کبھی چوکنا ہو کر اردگرد کا جائزہ لینا اور ذرا بچ بچ کر' پرے ہٹ ہٹ کر ایک طرف ہونا' ٹی وی پر ریڈیو پر روز اشتہار آتا تھا کہ کسی بھی مشکوک حرکت یا شے کو نظرانداز نہ کریں' خیال آیا اپنے لئے نہ سہی دوسروں کے لئے ہی' اسے اس عورت پر نظر رکھنا چاہئے' چنانچہ وہ ذرا اس کے قریب آ گیا۔
بس سٹاپ پر اس وقت رش نہیں تھا کیونکہ چھٹی ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا اور لوگ گھروں کو نکل گئے تھے' اب تو بس اکا دکا پیچھے رہ جانے والے باقی تھے' اس کے قریب آنے سے عورت چونکی' لمحہ بھر کے لئے اس نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا اور سمٹ کر بس سٹاپ کی دیوار سے لگ گئی' یوں لگا جیسے اس نے چادر میں لپٹی ہوئی شے کو زیادہ مضبوطی سے سینے سے چمٹا لیا ہو۔

وہ ذرا سا اور قریب آ گیا اور جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو'
بولا---- "پتہ نہیں اب بس آتی بھی ہے کہ نہیں"

یہ سن کر عورت نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا---- "بس نہیں آئے گی تو پھر-----"

اسی وقت ایک ٹیکسی قریب آن رکی' ڈرائیور نے منہ نکال کر کہا----
"چار نمبر تک پانچ پانچ روپے"

چار پانچ لوگ جو بس سٹاپ کے آس پاس تھے' دوڑ کر ٹیکسی کی طرف لپکے اور ایک دوسرے کو دھکیل دھکال کر' ٹیکسی میں گھس گئے۔ اب بس سٹاپ پر وہی دو رہ گئے۔

عورت نے شک اور گھبراہٹ سے اس کی طرف دیکھا---- "تو بس نہیں آئے گی؟"

"شاید"

"تو پھر----" اس نے چادر میں لپٹی شے کو اور مضبوطی سے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"آپ نے کہاں جانا ہے؟"

وہ چپ رہی' خاصی دیر چپ رہی پھر دھیرے سے بولی---- "گھر"

"کہاں ہے آپ کا گھر؟"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی نمی چمکی' کچھ بے بسی سی' کچھ اجنبیت سی'

"میرا گھر----" بے ربط سا جملہ' نامکمل۔

"ہاں آپ کا گھر' میرا مطلب ہے آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں" اب اس کی حیرت میں شک زیادہ تھا۔ "تو آپ کہیں باہر سے آ رہی ہیں۔"

"نہیں تو" اب ذرا سی سنبھل گئی تھی۔ "لیکن یہ بس۔"

"شاید کہیں کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے" اس نے فضا میں پھیلے خوف اور خاموشی کو سونگھتے ہوئے کہا---- "لگتا ہے بسیں بند ہو گئی ہیں' اب شاید-----"

وہ تیز ہوا کی زد میں آئی تنہا شاخ کی طرف کانپی' چادر میں لپٹی شے کے گرد اپنے بازوؤں کے حصار کو تنگ کرتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی "تو پھر ہم-----"

اس نے چادر میں لپٹی شے کی طرف گھبرا کر دیکھا۔

"یہ کیا ہے" اب وہ نہ رہ سکا۔

"یہ-----" وہ چونکی ہو گئی' چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی----" یہ----- یہ بچہ------ میرا بچہ"

"اوہ" اس کے سینے سے اطمینان کی گہری سانس یوں نکلی جیسے کوئی پرندہ قفس سے آزاد ہوا ہو۔

سڑک دور دور تک خالی ہو گئی تھی۔ قدرے خاموشی کے بعد وہ بولا----

"میرا خیال ہے بسیں رک گئی ہیں' شاید کوئی ٹیکسی آجائے تو ہم شیئر (Share) کر لیں' لیکن آپ نے جانا کہاں ہے؟"

اس نے جیسے آخری بات سنی ہی نہیں------ "لیکن اگر ٹیکسی نہ آئی۔"

"تو پیدل ہی' گلیوں میں سے بچتے بچاتے' لیکن آپ نے-----"

"یہ ٹھیک ہے" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی----" یہ بالکل ٹھیک ہے' گلیوں میں سے بچتے چاتے" اس نے چادر میں لپٹے بچے کے گرد بازوؤں کے حصار کو مضبوط کیا اور کوئی بات کئے بغیر وہ آگے پیچھے' ایک گلی میں مڑ گئے۔

میں تو اپنے گھر جا رہا ہوں----- اس نے سوچا---- اور یہ۔ وہ ذرا آہستہ ہو کر اس کے برابر آ گیا۔ وہ بچے کو مضبوطی سے سینے سے چمٹائے پھونک پھونک کر قدم رکھتی' چونکی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیتی اس سے دو چار قدم پیچھے تھی' اس کے برابر آنے سے ذرا سی گھبرا گئی۔ وہ سمجھا شاید بچے کے بوجھ سے تھک گئی ہے بولا---- "بچہ مجھے دے دیجئے۔"

"کیوں" وہ گھبرا کر دو چار قدم دور ہٹ گئی---- "کیوں" اور اس نے چادر میں لپٹے بچے کو بانہوں کے حصار میں اس طرح دبا لیا کہ بمشکل چادر ہی نظر

آئی۔

"میرا مطلب ہے----- نہیں نہیں، آپ شاید غلط سمجھیں، میں تو----- اصل میں میرا مطلب تھا کہ آپ بچے کو اٹھائے اٹھائے تھک گئی ہیں۔ اس لئے۔"

وہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی---- دیکھتی رہی پھر جیسے اس کے چہرے پر اعتماد کی ایک لہر سی گزری۔

"میں تھکی نہیں اور یہ بچہ-----"

اسی لمحے کہیں قریب ہی سے گولیوں کے چلنے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ سنسان گلی میں دور تک کوئی نہیں تھا، وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھک گئے۔ آگے بڑھیں یا رک جائیں، گلی سنسان اور دروازے بند---- یہاں تو پناہ کے لئے بھی کوئی دروازہ نہیں کھلتا، کون جانے پناہ مانگنے والے کون ہیں؟

فضا میں پھیلے خوف کی بو نے انہیں تیز کر دیا۔ اب وہ برابر چل رہے تھے۔

"یہ بچہ----" وہ آپ ہی آپ بولی۔

"یہ بچہ----" اس نے استفسار سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا اس بچے کو، ٹھیک تو ہے نا۔"

"یہ بچہ----" وہ یکدم پرجوش سی ہو گئی، اس کی آنکھوں میں اعتماد کی چمک پیدا ہوئی۔ "یہ بچہ ہی تو ہمیں بچائے گا۔"

وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"یہ کوئی عام بچہ نہیں" وہ جیسے اس کی خاموشی سے لطف اندوز ہوئی---- "یہ تو بچانے والا ہے۔"

"بچانے والا۔"

"ہاں----- مجھے بشارت ہوئی تھی۔"

"بشارت۔"

"ہاں بشارت۔" وہ رک رک کر بولی جیسے فضا میں لکھی کوئی تحریر پڑھ رہی ہو---- "ہمارا شہر جل رہا ہے، میں بھی جلی ہوں--- میرا بھائی۔" اس کی آواز

آنسوؤں میں بھیگ گئی----- "روتے روتے ایک رات آنکھ لگی تو خواب میں دیکھا کہ سمندر کنارے ایک ٹیلے کی اوٹ میں یہ پڑا ہے' ایک غیبی آواز آئی کہ یہی تو ہے جو شہر کو اس آگ سے بچائے گا۔"

گولیوں کی تڑ تڑ کبھی دور ہوتی' کبھی بہت قریب آ جاتی' ایک دوسرے کا سہارا لیتے' چھجوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑ گئے۔

"یہ---- یہ" اس نے بازوؤں کے حصار کو مضبوط بناتے ہوئے کہا---- "اس شہر کو ضرور بچائے گا' لیکن پہلے اسے بچانا ہے اور میں دو دنوں سے اسے لئے لئے پھر رہی ہوں۔"

"ہاں شہر کو بچانا ہے----" وہ بڑبڑایا----- "اس شہر کو بچانا ہے۔"

اس کے اندر اعتماد اور سکون کی ایک گرم لہر نے انگڑائی لی------ "ہم اس بچے کی----- ہم دونوں اس بچے کی-----"

اس نے تشکر اور ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا----- "یہ گلی بڑی سڑک پر نکلے گی' ہمیں دوڑ کر سڑک کراس کرنا ہے۔ سامنے والی گلی میں داخل ہو کر ہم محفوظ ہو جائیں گے۔"

وہ اس کے قریب ہو گئی۔ "میں دوڑ لوں گی۔"

"بس اب تیز---- ہم سڑک پر پہنچنے ہی والے ہیں۔"

لیکن ابھی وہ گلی کے اندر ہی تھے کہ گلی کے دہانے سے کلاشنکوف کی نالی اندر آئی' انہوں نے گھبرا کر پہلے ایک دوسرے کو اور پھر بیک وقت چادر میں لپٹے بچے کی طرف دیکھا۔

"یہ بچہ انہیں ضرور-----" دونوں نے بیک وقت سوچا۔

لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ چادر میں لپٹے لپٹے' دم گھٹنے سے بچہ کبھی کا مر چکا ہے۔

دھندلکا

یوں لگتا تھا جیسے سکرپٹ میں اس کا کردار اسے بتائے بغیر تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ واقعات اور اس کے خیالات میں کوئی تا میل نہیں رہا تھا' اب اگر یہیں سے شروع کیا جائے کہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا اور صرف تازہ ہوا کھانے کے چکر میں باہر نکل آیا تھا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں یہی تھا کہ ہوٹل میں کوئی نہ کوئی دوست مل ہی جائے گا۔ کچھ دیر تک گپ شپ ہو جائے گی اور بس۔ موڑ مڑ کر ابھی وہ بڑی سڑک پر کچھ ہی دور گیا تھا کہ کنارے کھڑے ایک شخص نے ہاتھ دیا۔ غیر شعوری طور پر موٹر سائیکل کی رفتار کم ہو گئی۔
"مجھے پوسٹ آفس تک جانا ہے۔ مہربانی" وہ پیچھے بیٹھے ہوئے بولا۔ اس نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے گیئر لگا دیا۔ موٹر سائیکل اپنی روانی میں آگے بڑھ گئی۔ نہ اس نے کوئی بات کی نہ پیچھے والا کچھ بولا۔ بس سڑک تیزی سے موٹر سائیکل کے پہیوں کے نیچے سے سرکتی رہی بڑے چوک سے ذرا سا پہلے ناکہ لگا ہوا تھا۔ پیچھے والا ایک دم بولا "ذرا آہستہ کیجئے" اس نے گیئر بدل کر جتنی دیر میں رفتار کم کی۔ پیچھے والا تیزی سے اتر کر بائیں طرف کی گلیوں میں ہولیا۔ منہ پر پڑنے والی ٹارچ کی روشنی نے موٹر سائیکل کو تقریباً ساکت کر دیا۔ اس نے موٹر سائیکل کھڑی کر کے جیب سے لائسنس نکال کر تھانیدار کی طرف بڑھایا جس نے دو چار سپاہیوں کے ساتھ اس کے گرد تقریباً" گھیرا ڈالا دیا تھا۔ تھانیدار نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟" تھانیدار کی چھڑی کی روشنی میں اس

نے مڑ کر کیرئیر کی طرف دیکھا۔

"یہ ---- یہ میرا تو نہیں تھا" وہ ہکلاتے ہوئے بولا --- "یہ تو --- شاید"

تھانیدار نے پیکٹ پر بندھی ہوئی رسی کو بے تابی سے توڑا۔ ریپر کھولا۔ ایک نظر ڈالی اور پھر سپاہیوں نے اسے دبوچ کر پولیس وین میں ڈالا دیا جو اس دوران ان کے قریب آ گئی تھی۔

وہ ساری رات اس سے یہی پوچھتے رہے کہ یہ پمفلٹ کس پریس میں چھپے ہیں اور اس کے باقی ساتھی کون ہیں۔ اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس دوران مار کھا کھا کر اس کی آنکھ سوجھ گئی۔ جسم پر جابجا نیل پڑ گئے اور شاید ٹخنے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی کیونکہ تھانیدار کی ٹھوکر کے بعد ٹیسوں نے اب تیز درد کی صورت اختیار کر لی تھی۔

صبح جب چمکیلی دھوپ چاروں طرف اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھی وہ ایک ایسے گہرے اندھیرے میں گردن گردن ڈوبا ہوا تھا جس میں اپنا وجود بھی غیر محسوس ہو گیا تھا۔ درد کی ٹیس کہاں سے اٹھتی تھی اور کہاں جاتی تھی' اس کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ بس ایک گہرا اندھیرا تھا' جس میں اس کا وجود کبھی ڈوبتا کبھی ابھرتا' پھر یوں لگا جیسے اندھیرا اور غلاظت ایک دوسرے میں لت پت ہو گئے ہیں' ایک کیچڑ سا اس کے نچلے دھڑ سے لپٹ گیا ہے۔ جس کی نمی اسے کاٹ رہی ہے۔ وقت گزر رہا تھا یا تھم گیا تھا۔ آوازیں موجود تھیں یا سب کچھ بے آواز تھا' بس اس کے سانس کی دھڑکنیں تھیں' یہی وقت کے گزرنے کی علامت تھی' سونے جاگنے کی اس ملی جلی کیفیت اور ہونٹوں کے کسی کونے سے رس رس کر آنے والے لہو کے نمکین ذائقے میں شائد دن گزر گیا۔ باہر کومل تاریکی دبے پاؤں بالکونیوں سے کمروں میں اتر آئی۔ اندر تیز روشنیوں میں نہا گیا۔ ایک تیز کاٹتی روشنی اس کے چہرے پر عکس ہو گئی۔ اس کی سوجی آنکھیں اور بند ہو گئیں۔ ٹھڈوں' گالیوں اور کسی ہنٹر نما تیز شراپ میں جسم بے حس ہو گیا۔ آوزیں کہیں دور سے اور کبھی قریب سے آتیں۔

"پریس کہاں ہے؟"

"دوسرے لوگ کون ہیں؟"

لفظ بے معنی تھے۔ لمحہ بھر کے لئے آنکھوں میں حرکت ہوئی تو جسم کے کسی حصے میں درد لہرا کر رقص کرتا' پھر آوازوں اور روشنیوں کا بھنور گھومنے لگتا اور وہ ڈوبتا چلا جاتا۔ نیچے اور نیچے گہرائیوں کی طرف۔

روشنیوں اور تاریکیوں کی آنکھ مچولی میں غلاظت اور نمی میں لت پت کبھی ہونے اور کبھی نہ ہونے کے احساس میں گھر ایک موہوم نقطے کی طرح ابھرتا' پھیلتا اور ڈوب جاتا۔ اس کا وجود اب صرف گالی تھا جس سے اسے پکارا جاتا۔ بے معنی سوال جو اس کی سمجھ میں نہ آتے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے جواب جو دوسرں کے پلے نہ پڑتے۔ نام اور شخصیت دونوں ہی بے نام اور گمنام ہو گئے تھے۔ کوئی اس کا ہے بھی؟

دن' وقت' لمحے تھے تو کہاں' اس کے آس پاس تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا' یا پھر اس اندھیرے کے بطن سے نکلتی وہ تیز روشنی جو سیدھے اس کے منہ پر پڑتی اور زخمی چہرے اور سوجی آنکھوں پر چھروں کی طرح لگتی۔

بہت دونوں بعد یا صدیوں بعد اس گھور اندھرے میں ایک نحیف سی کرن چمکی' کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اسے حیرت ہوئی۔ "تو کیا یہ میں ہوں۔ فلاں ابن فلاں ابن فلاں"--- اس گھپ اندھیرے میں تو نام کوئی شے نہیں' بس نہ سمجھنے والے سوالوں کی ایک بوچھار اور گالیوں' تھپڑوں اور ٹھڈوں کا ایک طوفان'--- اس کا تو وہ نام نہیں جس سے اسے پکارا جاتا تھا۔ اور یہ نام' شائد اسی کا ہے' تو پکارنے والا کون ہے۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھوں کو مشکل سے کھولا۔ ایک دھندلا سا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔

آہستگی اور شفقت سے ہلتے ہونٹوں سے پھر اس کا نام نکلا۔ "میں---" سوجے پھٹے ہونٹوں سے سسکاری سی نکلی۔ دھندلا سا چہرہ پیچھے ہٹا۔ اس کی سوجی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ہر شے سفید تھی' سفید بستر' سفید چادر اور سفید لباس میں اس پر جھکا ہوا شفیق سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے ابھرے ہوئے نیلوں نے پپوٹوں کو پھر جھکا دیا۔ ملی جلی آوازوں کے مدھم بھنور نے اسے اپنے اندر سمو لیا۔ نیم وا آنکھوں سے دیکھا تشویش' محبت اور فکر سے بھری گئی

نظریں اس پر جھکی آ رہی تھیں۔

پھر آنکھ کھلی تو ساری فضا میں مانوسیت کا احساس تھا۔ کمرہ بھی اپنا تھا اور بستر بھی وہی۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟" اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"نیند میں ڈر گئے تھے۔ شائد کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے" ایک شفیق محبت بھری آواز نے جواب دیا

"لیکن ---" اس نے پسلیوں میں سرسراتے درد اور چہرے کی اینٹھن کو محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے کہا --- "خواب ----- لیکن خواب میں سچ مچ تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے نشانات تو ---"

"بعض خواب عجیب ہوتے ہیں" شفیق آواز نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لیکن وہ موٹر سائیکل اور وہ -----' وہ بڑبڑایا۔ پھر فوراً" ہی خیال آیا اس کے پاس تو موٹر سائیکل ہے ہی نہیں۔ وہ تو پیدل یا بسوں میں سفر کرتا ہے۔ تو پھر -----

شائد بعض اوقات کردار کو بتائے بغیر سکرپٹ میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ تو بس جب سکرپٹ کچھ اور ہو اور کردار کچھ اور تو کئی طرح کی گڑ بڑ ہو جاتی ہے--- اسے کچھ سمجھ نہ آیا' غنودگی نے اسے پھر اپنی بکل میں دبا لیا اور وہ کروٹ بدل کر گہری نیند سو گیا۔

نہیں تعبیر کوئی

گاؤں کے سارے وسنیک پنڈال میں جمع تھے۔ سہرا باندھنے کے بعد اسے رنگ دار رسیوں کی بنی ہوئی اونچی چوکی پر بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ، جس کے لئے اس نے برسوں خواب بنے تھے، سرخ جوڑا پہنے سہیلیوں کے جھرمٹ میں پنڈال میں آئی۔ مہندی بھری انگلیوں نے ڈھولک کو چھوا، تھاپ کی آواز رقص کرتی چاروں طرف پھیل گئی، اس کے ساتھ ہی ماہیے کے بول انگڑائیاں لیتے فضا میں تیرنے لگے۔ محفل ابھی جمی ہی تھی کہ اس لمحے جب وہ کن انکھیوں سے، سرخ جوڑے میں سمٹی سمٹائی دلہن کو دیکھ رہا تھا، وہ جنوب مشرقی سمت سے گاؤں میں داخل ہوا اور لاٹھی ٹیکتا پنڈال میں آگیا۔ اس لمحے ڈھولک کی تھاپ اور ماہیے کے بول پنڈال میں گونج رہے تھے۔ قہقہوں، باتوں اور جگتوں کی آوازیں میلے کا سا سماں باندھے ہوئے تھیں۔ اس کے اندر آتے ہی چند ہی لمحوں میں خودبخود ایک خاموشی چھا گئی۔

ایک پراسرار چپ----- ڈھولک پر تھاپ لگاتیں انگلیں جہاں تھیں وہیں جمی رہ گئیں۔ بول ہونٹوں کے دریچوں میں سمٹ گئے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آنے والے کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے کوئی پراسرار شے آنے والے کی آنکھوں سے نکل کر اس کے وجود میں گم ہو گئی ہے، ماہیے کے بول دور ہوتے چلے گئے اور وہ، وہ بھی جو سرخ جوڑا پہنے اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی آسمان سے ٹوٹے تارے کی طرح دور ہوتی ہوئی معدوم ہوتی چلی گئی۔

آنے والا مڑا اور لاٹھی ٹیکتا مغرب کی طرف چل پڑا۔ اس نے اپنا سہرا اتارا اور کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گاؤں سے نکل رہے تھے تو پیچھے سے آتی آوازوں کا ایک ہجوم دامن تھام رہا تھا ان میں

اس کی کرلاتی آواز بھی تھی جو سرخ جوڑا پہنے اس کے لئے پنڈال میں آئی تھی لیکن اس کے اندر کوئی پراسرار شے آن بسی تھی۔ جس نے لمحہ بھر میں اسے ساری آوازوں سے دور کر دیا--- سارے رشتے ناتے بے معنی ہو گئے۔

وہ اس کے پیچھے چپ چاپ چلتا رہا۔ جنگلوں صحراؤں اور شہروں سے گزرتے جب وہ ایک بڑے دریا کے کنارے پہنچے تو اس نے پوچھا--- "اے شیخ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

شیخ نے مڑے بغیر جواب دیا--- "منزل کی طرف" اس نے پوچھا--- "منزل کہاں ہے؟"

شیخ نے پھر بغیر مڑے جواب دیا--- "جدھر ہم جا رہے ہیں؟"

اب کچھ پوچھنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

پتھروں، کنکروں، صحراؤں اور سبز گھاس پر چلتے وہ کئی مہینوں بعد ایک بستی میں داخل ہوئے جہاں ایک بڑی درگاہ تھی۔ جب وہ شیخ کے پیچھے پیچھے درگاہ کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہونے لگا تو دفعتہً آوازوں، یادوں اور خوابوں کے ایک ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے دل میں تاسف پیدا ہوا۔ ڈھولک کی تھاپ اور ماہیے کے بول کانوں میں گونجنے لگے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

شیخ نے مڑ کر دیکھا اور بولے--- "لوٹ کر دیکھنے سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو منظر پیچھے رہ جائے وہ دھندلاتے دھندلاتے معدوم ہو جاتا ہے۔"

اس نے سر ہلایا--- "لیکن خوابوں کی لذت---"

شیخ مسکرائے--- "لیکن ایک خواب اور بھی ہے--- جس کی لذت سب سے انوکھی ہے--- خود کو جاننے کا خواب۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ اس خواب کی لذت اس کے لئے ابھی اجنبی تھی۔ لیکن چند ہفتوں بعد ہی وہ اس ذائقہ سے واقف ہو گیا۔ ایک رات جب وہ دیر تک درگاہ کے ایک کونے میں بیٹھا شیخ کا بتایا ہوا ورد کر رہا تھا۔ شیخ ایک عجیب پراسرار ہیولے کی صورت میں اس پر منکشف ہوئے اور اس لمحے اس نے وہ کچھ دیکھا جو اس سے پہلے

اسے معلوم نہ تھا۔

ایک اور ہی طرح کی لذت----- جس کے ذائقوں نے اسے سب سے بے نیاز کر دیا۔ ڈھولک کی تھاپ ماہیے کے بول' پنڈال میں ناچتی آوازیں اور سرخ جوڑا پہنے وہ---- سب دور کسی اندھے فاصلے کی دھند میں گم ہو گئے۔ کئی برس بیت گئے۔

ایک شب شیخ نے اسے بلایا اور اپنے ہاتھ سے اپنی دستار اس کے سر پر رکھی۔ اگلے دن ان کا وصال ہو گیا۔ دستور کے مطابق اسے شیخ کے مرشد کی درگاہ پر حاضری دینے جنوب مشرق کی طرف طویل سفر کے لئے تیار ہونا پڑا۔

حاضری دے کر جب وہ لوٹ رہا تھا تو شام ڈھلے اس گاؤں کی سرحد میں داخل ہوا۔ کھیتوں کی خوشبو اور مٹی کی باس نے اس کے اندر کہیں چٹکی سی لی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ کئی ماہ سال چشم زدن میں آگے پیچھے ہو گئے۔ سرسبزی اور کھیتوں کی لہلہاہٹ نے ایک عجیب طرح کی گنگناہٹ کی صورت اختیار کر لی۔ لگا آوازوں' رنگوں اور جذبوں کا ایک دریا اسے اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے۔

رات گہری ہوئی جا رہی تھی اور گاؤں کی سمت سے ڈھولک کی تھاپ اور ماہیے کے بولوں کی آوازیں لہروں کی طرح اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہ پنڈال میں داخل ہوا تو گاؤں کی لڑکیاں ڈھول کی تھاپ پر ماہیے گا رہی تھیں۔ دلہن سرخ جوڑا پہنے اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں شرما شرما رہی تھی' دولہا سہرا باندھے رنگ دار رسیوں کی بنی اونچی چوکی پر بیٹھا' کن انکھیوں سے دلہن کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک پراسرار خاموشی چھا گئی۔ ڈھولک پر تھاپ لگاتی انگلیاں جہاں تھیں وہی رہ گئیں۔ بول ہونٹوں پر ہی اٹک گئے۔ دولہا نے سہرا الٹا اور کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں' لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور ہوتا' ایک بوڑھی عورت دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آ گئی اور چیختے ہوئے بولی---- "کئی برس پہلے تم اسی طرح میری تمناؤں کو لوٹ کر لے گئے تھے" اب بیٹے کو لینے آ

گئے ہو۔"

وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ گیا' زمانے نے عورت کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بن دیا تھا لیکن ان کے پیچھے چہرہ تو وہی تھا---- وہی جس کے لئے اس نے برسوں خواب دیکھے تھے۔ "بولو----- بولو تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟" عورت روہانسی ہو گئی۔"

"میں----" لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

عورت اس کی آواز سن کر چونکی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئی---- "تم"

پھر کوئی کچھ نہ بولا----- وہ خاموشی سے مڑا اور پنڈال کو کاٹتا ہوا اپنے راستے پر ہو لیا۔ کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ کوئی پیچھے چلا آتا ہے۔

"جوان لوٹ جاؤ" اس نے مڑ کر کہا۔ لیکن وہ جوان نہیں تھا۔ عورت کا لڑکھڑاتا سایا تھا۔ اس کے سارے وجود میں ایک یخ لہر دوڑ گئی۔

"نہیں---- نہیں" وہ چیختا ہوا دوڑنے لگا۔

اسے لگا ایک ہی لمحے میں اس مقام پر آن پہنچا ہے جہاں سے برسوں پہلے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دن صدیوں کی دوری

جوں جوں رات کی سیاہی گاڑھی ہوتی جاتی ہے اس ڈب کھڑبے فرش میں ایک ملائمت آتی جاتی ہے۔ طبلے اور سازوں کے سر ایک دوسرے سے ملاپ کرتے آہستہ آہستہ ایک الاپ میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ تیز روشنی کا ہالہ پورے دالان کو اپنی آغوش میں لے کر لمحہ بھر میں تر و تازہ کر دیتا ہے۔ دھیمے سروں میں خوشبو کی طرح بل کھاتے الاپ میں سے اس کی مدھر آواز یوں ابھرتی ہے جیسے کوئی انگڑائی لیتا بستر شب سے اٹھتا ہے۔ اگلے لمحے سب کچھ نمایاں ہو جاتا ہے۔

بلند مسند پر شاہانہ وقار سے بیٹھا مراد خان ہاتھ کے اشارے سے خوشنودی کا اظہار کرتا ہے۔ چشم زدن میں گھونگھروں کی تال چھم چھم کرتی پورے دائرے کا چکر کاٹتی ہے اور انگڑائیاں لیتی مدھر آواز کے ساتھ سارے دالان میں گھوم جاتی ہے۔ نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے مراد خان کے مصاحبوں کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

اس نیم دائرے میں کہیں میں بھی ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور کس عہد میں جی رہا ہوں۔ رات کی تاریکی پھیلتے ہی میں مراد خان کے مصاحبین میں شامل ہو جاتا ہوں یوں لگتا ہے میرا جینا مرنا اسی دالان سے وابستہ ہے جشن رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ وہ دونوں بج سجا کر آتی ہیں۔ ایک اپنی آواز سے اور دوسری اپنے اعضاء سے محفل پر وجد طاری کر دیتی ہے۔ مراد خان کے منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد شروع کر دیتا ہیں۔

رات جب ڈوبنے لگتی ہے تو محفل آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ صبح صادق کی ملگجی روشنی کے ساتھ ساتھ سب کچھ غائب ہو جاتا ہے۔ نرم ملائم فرش پھر ڈب کھڑبا ہو جاتا ہے اور ایک خوفناک سناٹا چھلانگ مار کر بیچوں بیچ آ بیٹھتا ہے۔

اب رات کے منظر میں سے کچھ بھی باقی نہیں' سوائے میرے' لیکن اب میں مراد خان کا مصاحب نہیں۔ تیل تلاش کرنے والی ایک کمپنی کا انجنیئر ہوں جو تیل کی تلاش میں اس صحرا میں سرگرداں ہے۔ میرا خیمہ اس کھنڈر سے آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کب اور کیسے پہنچا ہوں۔ یاد پڑتا ہے کہ رات کو حسب معمول پڑھتے پڑھتے آنکھ لگی تھی----- پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ شاید اس مدھر آواز اور گھنگھروؤں کی تال کا پیچھا کرتا یہاں آ نکلا۔

جشن کب کا ختم ہو چکا۔ اب ایک ہولناک سناٹا ہے اور میں ہوں کہ ایک عجب پہچان اور ناپہچانی کے عالم میں ان ویران درودیوار کو تکے جا رہا ہوں۔

"مراد خان----" میں اپنے ذہن پر زور دیتا ہوں یہ نام کتنا مانوس ہے' لیکن خنجر کی طرح کاٹ دار کہ اس کے تصور ہی سے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔

میرا بیٹ مین مجھے تلاش کرتا ادھر آ نکلتا ہے اور کہتا ہے----- "شکر ہے---- مجھے پہلے ہی پتہ تھا آپ یہیں ہوں گے۔"

"مراد خان" میرے ذہن میں کوئی کلبلاتا ہے۔

مقامی لوگوں سے اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ یہ کھنڈر اس کا محل تھا لیکن یہ بات صدیوں پرانی ہے۔ اب یہ سارا علاقہ ایک ویران صحرا ہے جس میں تیل تلاش کیا جا رہا ہے۔ مقامی آبادی درختوں کے جھنڈ سے کافی پرے ہے۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس ہی تپتے صحرا کے کنارے خانہ بدوشوں کے کچھ خیمے ہیں جو نہ معلوم عرصہ سے وہاں رہ رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس صحرا میں جہاں پانی کی بوند بوند کو ترستے ہیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں اور اس صحرا سے ان کا کیا رشتہ ہے۔ صحرا کے بیچوں بیچ یہ کھنڈر اور اس سے ملحقہ کچھ خستہ عمارتیں ہیں جن کے سامنے ایک پرانا کنواں ہے۔ یہ کنواں مدتوں سے بند تھا۔ کمپنی نے اسے صاف کروا کے اس پر موٹر لگا دی ہے ہمارے خیمے یہاں سے فرلانگ بھر آگے ہیں۔ صبح ہوتے ہی خانہ بدوش عورتیں گھڑے سروں پر اٹھائے کنویں کے اردگرد منڈلانے لگتی ہیں اور پانی کے ایک ایک گھڑے کے لئے منتیں کرتی ہیں۔

میں کام ختم کر کے شام کو اس کنویں کی منڈیر پر آ بیٹھتا ہوں اور چپ چاپ کھنڈر کو تکتا رہتا ہوں "مراد خان" میرے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ اس کے رت جگوں کا ایک مصاحب میں بھی اور وہ دونوں تو ان رت جگوں کی شمعیں تھیں۔ میں ان کو اچھی طرح پہچانتا ہوں------- وہ اب بھی گھڑے اٹھائے اس کنویں پر آتی ہیں اور گڑگڑا کر پانی مانگتی ہیں۔

اس شام میں وہاں اکیلا تھا۔ وہ دونوں کچھ فاصلے پر رک گئیں اور خاموشی سے مجھے تکنے لگیں۔

میں نے پوچھا---- "پانی چاہئے۔"

ان کے چہروں پر ایک تمتماتی خوشی جاگ اٹھی۔ میں نے موٹر آن کر دی۔ پانی کا فوارہ اچھلتا ہوا پائپ کے منہ سے نکلا۔ گھڑے بھرتے ہوئے ان میں سے چھوٹی کو جانے کیا سوجھی کہ وہ خود فوارے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

صدیوں سے پیاسا اس کا بدن پانی کو چھوتے ہی لہلہا اٹھا۔ ململ کا کرتا بدن کے تناؤ میں جذب ہو کر اوجھل ہو گیا۔

سارا کھنڈر زندگی کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

سنگ مرمر کے فوارے کے نیچے اس کے غسل کا منظر عجب تھا۔ مراد خان اسے دیکھنے کے لئے اپنی شاہانہ مسند سے نیچے جھک آیا تھا۔

اس کے بدن کی لہک، مہک اور مراد خان کی شوق بھری نظریں---- اور میں، میں کہاں تھا۔ شاید مراد خان کی آنکھوں کے دریچوں میں چھپا یہ سب دیکھ رہا تھا، یا میں کہیں اور تھا۔

لیکن اس وقت میں کنویں کی منڈیر پر تھا اور موٹر کے پائپ سے نکلتے تیز پانی میں اس کا رقص۔ بڑی والی کچھ دیر اپنے شوق کو دبائے رہی پھر جست لگا کر وہ بھی پانی کے دائرے میں اتر آئی۔

عجب منظر تھا۔

مراد خان سنگ مرمر کے فوارے کی دیوار پر جھک آیا تھا اور بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو ہلا رہا تھا۔ چاندی جیسی اچھلتی تاروں میں وہ دونوں اٹھکیلیاں کر

رہی تھیں ململ کے لباس ان کے بدنوں کی کمانوں میں ڈوب گئے تھے۔ ایک ایک قوس' ایک ایک زاویہ حشر بکھیر رہا تھا۔ پھر دھیمے دھیمے الاپ کی آواز ابھری گھنگھرو جھنکے اور آواز کا جادو جاگ اٹھا۔

مراد خان کے اس دالان میں نیم دائرے میں بیٹھے بیٹھے میں ہمیشہ غنود جاتا ہوں دفعتا" سناٹا چھا گیا۔

میرے بیٹ مین نے موٹر بند کر دی تھی۔

میں نے چونک کر کہا---- "انہیں پانی تو بھر لینے دو" بیٹ مین نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا---- "وہ تو کب کی پانی بھر کر جا چکیں۔"

"جا چکیں" میں نے اپنے آپ سے کہا---- ہمیشہ یوں ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر اپنے فن میں بڑی طاق ہیں۔ دوسری خانہ بدوش لڑکیوں کی نسبت سبھاؤ سے ناچتی گاتی ہیں۔ جوں جوں رات کی سیاہی صحرا کے وسیع صحن میں اترنے لگتی ہے خیموں سے اٹھتی ان کی مدھر آواز کے بھنور صحرا کی وسعتوں میں پھیلنے لگتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کھنڈر بھی آباد ہونے لگتا ہے۔ پہلے ڈب کھڑبا فرش سنگ مرمر کی ملائمت میں بدلتا ہے۔ پھر در و دیوار روشن ہوتے ہیں۔ مراد خان کی مسند بجتی ہے اور نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے احتراما" کھڑے ہو کر مراد خان کے بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں۔ خیموں سے بلند ہوتی آوازوں اور پائل کی جھنکار صدیوں کا فاصلہ طے کر کے لمحہ بھر میں اس دالان میں اتر آتی ہے۔ طبلے والا اور سازندے سر ملاتے ہیں' پھر بڑی کی آواز ان میں شامل ہو جاتی ہے ابھی مکھڑے کا الاپ شروع ہی ہوتا ہے کہ مراد خان ہاتھ کے اشارے سے سب کچھ روک دیتا ہے۔

"دوسری کہاں ہے؟" اس کی گرجدار آواز گونجتی ہے۔

محفل میں سناٹا چھا جاتا ہے۔

کہاں ہے وہ-------

کوئی کچھ نہیں بولتا۔

مراد خان اپنی مسند سے اٹھ جاتا ہے اور تیزی سے نیم دائرے پر نظر ڈالتا ہے۔ ایک نشست خالی ہے۔

کتنے دنوں بعد کی بات ہے؟

مراد خان کے آدمی مجھے اور اسے ساتھ والے قصبے سے پکڑ لاتے ہیں۔ مراد خان مجھے دیکھ کر غصے سے بھبھنا اٹھتا ہے اور زور زور سے کچھ کہتا ہے۔ میں بھی کچھ کہتا ہوں۔ مراد خان میری بات سن کر اتنے غصے میں آتا ہے کہ تیزی سے خنجر نکال کر مجھ پر لپکتا ہے۔

درد کی ایک تیز ٹیس----- میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔

میرا بیٹ مین مجھ پر جھک آتا ہے اور کہتا ہے---- "صاحب جی میں پہلے ہی آپ کو کہتا تھا کہ رات کو کھنڈر کی طرف نہ جایا کریں۔ آپ پر یہ حملہ ضرور ان خانہ بدوشوں میں سے کسی نے کیا ہے----" وہ لمحہ بھر چپ رہتا ہے----- پھر کہتا ہے---- "میرا تو خیال ہے کہ یہ ان کے سردار مراد خان کی حرکت ہے۔"

"مراد خان" میں ایک دم اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن درد کی تیز ٹیس مجھے گرا دیتی ہے۔

"جی ہاں مراد خان۔ وہ جو دو پانی بھرنے آتی ہیں۔ آپ سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے چھوٹی مراد خان کی----" میں کچھ نہیں بولتا۔

یہ زخم بھی اپنی نشانی چھوڑ جائے گا---- ایک نشان پہلے بھی ہے، دور کہیں اندر کی طرف، دونوں میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔

لیکن ابھی شاید مجھے ایک تیسرا زخم بھی کھانا ہے!

بے منزل منزلیں

اسے خود معلوم نہیں کہ اس گھر کے ساتھ اس کا تعلق کتنا پرانا ہے؟ وہ اس گھر میں نہ کبھی رہا ہے اور نہ کبھی اس نے اسے دیکھا ہے' لیکن وہ اس کے کونے کونے سے واقف ہے اور جب چاہتا ہے لمحہ بھر میں اس کے اندر پہنچ جاتا ہے۔

بس ایک پل کے لئے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں اور دوسرے لمحے وہ اس گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا ہے۔ ڈیوڑھی کی نیم تاریکی میں ایک دروازہ دائیں طرف کھلتا ہے جو بیٹھک میں نکل جاتا ہے۔ بائیں طرف والے دروازے کے پیچھے ایک مستطیل نما کمرہ ہے جس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے اس تہہ خانے کا جالی دار جنگلا کمرے کے وسط میں موجود ہے نیچے گہری تاریکی۔

وہ کبھی اس تہہ خانے میں نہیں اترا۔ بس یہ معلوم ہے کہ اس کے اندر سردیوں میں جلائے جانے والی لکڑی رکھی جاتی ہے۔ سنا ہے ایک بار گھر کی کوئی مرغی جنگلے سے نیچے اتر گئی تھی۔ ایک زمانے میں یہاں سامان بھی رکھا جاتا تھا۔ مرغی وہیں رہ گئی اور کسی دیوار میں سے رستے پانی نے اسے زندگی فراہم کردی۔

ایک عرصہ بعد گھر والوں کو تہہ خانے سے چوں چوں کی آوازیں سنائی دیں تو کسی کو نیچے اتارا گیا۔ نیچے مرغیوں کا ایک پورا گھر آباد تھا۔ لیکن ان مرغیوں کو اوپر نہیں لایا گیا۔ اسے بس اتنا معلوم ہو سکا کہ جو شخص نیچے اترا تھا وہ سخت خوف زدہ اوپر آیا اور اس نے سرگوشیوں میں کسی کو کچھ کہا۔ اس کے پلے اتنا پڑا کہ ان مرغیوں کی آنکھیں نہیں ہیں۔

اس نے کئی بار ان کی آنکھوں کے بارے میں سوچا لیکن کوئی جواب بن نہ پڑا۔

وہ کی بار تہہ خانے کے دروازے کے پاس رکا۔ اندر سے ان کی چوں چوں

کی آوازیں بڑی پر اسرار لگتیں۔ دل چاہتا کہ اندر جا کر انہیں قریب سے دیکھے لیکن نیم تاریکی اور یہ تصور کہ ان کی آنکھیں نہیں اس کے ارادے کی دیوار کو ڈھا دیتا۔

گھر کا یہ حصہ ہمیشہ ہی نیم تاریک رہا جس کی وجہ سے ایک عجب طرح کی سیلن زدگی وہاں آنے والے کو اوپر جانے پر مجبور کر دیتی ہے سیڑھیاں تنگ اور موڑ والی تھیں۔ دو موڑ گزرنے کے بعد درمیان والا پلیٹ فارم---- یہاں تاریکی زیادہ گہری ہے اس کے دونوں طرف دروازے ہیں جو مختلف کمروں میں کھلتے ہیں۔ یہ حصہ سب سے زیادہ ڈراؤنا اور پر اسرار ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ہمیشہ ڈر جاتا ہے اور خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

لگتا ہے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولہ سا حرکت کر رہا ہے ایک لمبا ڈھانچہ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا دکھائی دیتا ہے۔ جب آنکھیں اندھیرے میں کچھ دیکھنے لگتی ہیں تو دو انگارہ سی آنکھیں اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوتی ہیں۔ لمبے لمبے بال جو شانوں سے نیچے لٹک رہے ہیں اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز۔

اس کے منہ سے چیخ نکلتی ہے اور لگتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی پتھر انگڑائی لے کر منجمد ہو گیا ہے۔ چیخ کی آواز پر اوپر دروازہ کھلتا ہے۔ ایک مشفق آواز اس کا نام پکارتی ہے۔ پتھر کی انگڑائی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ دوڑ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکتا ہے۔

سامنے دیوار کے ساتھ حرکت کرتا ہیولہ دو انگارہ آنکھیں اور منہ سے کف بکھیرتی پھنکار----

اوپر والا حصہ روشن اور پر سکون ہے۔ دو محبت بھری بانہیں اسے اپنے حصار میں چھپا کر پیشانی چومتی ہیں۔

یہ گھر جو موجود نہیں ہے لیکن موجود ہے' اس کا ایک ایک گوشہ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ باہر جب ذرا سی بھی تیز تند ہوا چلتی ہے تو وہ بھاگ کر اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں دو شفیق بانہیں اسے اپنے حصار میں لینے کے لئے بے قرار رہتی ہیں

اور محبت کے رس بھرے ہونٹ اس کی پیشانی چومنا چاہتے ہیں۔ شفقت اور محبت کی یہ روشنی اوپر والی منزل کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے درمیانی حصے سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس حصے سے گزرنے کے تصور ہی سے جھرجھری آجاتی ہے۔

نیم تاریک ڈیورھی جس کے آگے موڑ کھاتی تنگ سیڑھی ہے سیڑھی کے اوپر وہ چوکور خلاء جہاں تاریکی سیال مادے کی طرح گاڑھی اور نمدار ہے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ حرکت کرتا پراسرار ہیولہ---- دو انگارہ آنکھیں اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز' ڈر کے مارے چیخ نکل جاتی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ یہ ہیولہ کس کا ہے اور اس تاریک خلاء میں ہمیشہ کیوں موجود رہتا ہے----- اس اذیت کے بعد دو شفیق بانہیں اور محبت کے رس بھرے ہونٹ نعمت کی طرح ہیں لیکن وہ بھی یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ ہیولہ کس کا ہے اور کیوں وہاں موجود رہتا ہے رات کو کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ہیولہ دبے پاؤں اوپر آگیا ہے۔ پھر جیسے وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتا ہے۔ خوف کے مارے وہ شفیق بانہوں میں سمٹ جاتا ہے منہ سے آواز نہیں نکلتی۔ تادیر یہ کشمکش جاری رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ ہیولے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کا شور دور ہوتا جاتا ہے۔

اسے دیر تک نیند نہیں آتی۔ شفیق بانہوں کے حصار میں سمٹے سمٹے یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ ہیولہ کس کا ہے۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ یہ بانہیں اسے نرمی سے اپنے حصار سے نکلتی ہیں اور دو رس بھرے ہونٹ اس کی پیشانی پر محبت کے پھول کھلا دیتے ہیں۔ رات کا خوف پلک جھپکتے دور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مکار کے ساتھ آس پاس پھیل جاتا ہے اور دن کا تو اپنا ایک چہرہ ہے۔

سارا دن مشقت کا پیشہ جسم کو ریزہ ریزہ کرتا رہتا ہے۔ گھر کی دیوار سے اس آخری دیوار تک ایک نہ ختم ہونے والی بے چینی آس پاس موجود رہتی ہے۔ دو شفیق بانہیں اور دو رس بھرے ہونٹ' بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن

دن کے پہیئے کی کرخت آوازیں سارے تصور کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دیوار کے ساتھ حرکت کرتا پراسرار ہیولہ آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ سرخ انگارہ آنکھیں چمکتی ہیں اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی مسلسل آواز۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ خود سے سوال کرتا ہے "یہ خواب ہے یا وہ خواب ہے"

لیکن کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ خواب کون سا ہے۔ یہ جس سے وہ گزر رہا ہے یا وہ جس کا تصور اس کے اندر کہیں موجود ہے یا دو شفیق بانہوں کا حصار، ماتھے پر رس بھرے ہونٹوں کا بوسہ اور ان سب کے درمیان کہیں دھندلی سی نیم تاریکی میں ایک پراسرار حرکت کرتا ہیولہ جس کی لال انگارہ جیسی آنکھوں کو وہ کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہے اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آواز سن سکتا ہے۔

اور یہ جو اس کے اردگرد ایک کھلا منظر ہے۔ یہ کیا ہے؟

وہ شفیق بانہیں

اور یہ پراسرار ہیولہ؟

اسے ان میں سے کسی سوال کا جواب معلوم نہیں۔ جس گھر میں وہ رہتا ہے وہ ایک منزلہ ہے۔ نہ اس کی کوئی پراسرار ڈیوڑھی ہے اور نہ اوپر والی منزل جس تک پہنچنے کے لئے کسی درمیانی تاریک خلاء سے گزرنا پڑے۔

یہ گھر میں نے کہاں دیکھا ہے؟ اس نے کئی بار خود سے پوچھا ہے۔ مگر جواب نہیں ملا۔

جواب کسی کے پاس بھی نہیں کہ وہ شفیق بانہیں اور رس بھرے ہونٹ بھی اب نہیں کہ پوچھ سکے یہ اسرار کیا ہے؟

وہ ہیولہ کس کا ہے اور یہ دو لال انگارہ آنکھیں جو اسے اب بھی ڈرا دیتی ہیں کس کی ہیں۔

یہ ہیولہ ایک تیرتے عکس کی طرح ہے کہ غیر محسوس طور پر وہ اس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ پھر اسے کچھ احساس نہیں ہوتا ہے کہ وہ خود کون ہے اور یہ سارا اسرار کیسا ہے؟

کوئی کچھ بتانے والا نہیں بس ایک یاد سا ہے کہ ایک بار اس نے ان شفیق بانہوں میں پناہ لیتے ہوئے پوچھا تھا "یہ سب کیا ہے۔ یہ نیم تاریک خلاء کیا ہے؟"

رس بھرے ہونٹوں نے اس کے ماتھے پر محبت کے گلاب کھلاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا----- "پگلا----؟"

پھر نہ وہ شفیق بانہیں رہیں نہ وہ محبت بھرے ہونٹ' بس ہیولہ اور اس کی لال انگارہ آنکھیں باقی رہ گئی۔

برسوں بیت گئے---- ایک تیرتا عکس اس کے آس پاس کہیں موجود رہا' قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ آہستگی سے خود کو ایک طرف کر لیتا۔ کوئی پر اسرار شے اس کے پاس سے گزر جاتی---- اسے ایک سکون سا ملتا "آخر میں اسے خود سے دور کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں" اور وہ اندر ہی اندر گنگناتا۔ لیکن اب برسوں بعد اسے ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی کرخت آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑا۔

"کون ہے----؟" وہ چیخا۔

یوں لگا جیسے دو انگارہ آنکھیں اس کے اندر اترتی چلی جا رہی ہیں۔

"کون ہے-----؟"

اس کی چیخ سن کر بیوی بھی جاگ اٹھی۔

"کیا ہوا-----؟" وہ بوکھلا گئی۔

"وہ نیم تاریک ڈیوڑھی پھر-----" وہ بڑبڑایا۔

"کون سی ڈیوڑھی؟" بیوی حیرت سے بولی۔

"وہی-----" اس نے کہنا چاہا۔

"لیکن کہاں----؟" بیوی نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا وہ چند لمحے خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو---- بولا "کہیں بھی نہیں---- کہیں بھی نہیں---- وہ تو شاید میرے اپنے ہی اندر ہے"۔

بیوی کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران پریشان اسے دیکھتی رہی مگر وہ اس کی پریشانی سے بے نیاز اس طرح بڑبڑاتا رہا---- "میرے اپنے اندر---- میرے اپنے اندر"

نوحہ -1

رات کے اس پہر، زوال کے نشے میں مخمور، ڈھلوان پر سفر اور نہ سفری کی حالت میں وہ اپنے اپنے خوابوں، خیالوں اور کاموں میں ایسے گم ہیں کہ اندازہ ہی نہیں کر پاتے کہ وہ چل رہے ہیں یا کھڑے ہیں، کھڑے ہیں یا چل رہے ہیں۔ انہیں یہ جاننے کی کوئی ایسی خواہش بھی نہیں کہ ڈھلوان پر ہونا اپنی ایک تیزی رکھتا ہے لیکن انہوں نے تو ڈھلوان پر ہونے کو بھی ایک لطف میں بدل دیا ہے اور اس گرنے میں بھی ایک میلے کا سماں ہے کہ جو جس کے پاس ہے وہ اسے ختم کرنا چاہتا ہے، نیچے کھائی کتنی گہری ہے انہیں اس کا غم نہیں بلکہ یوں کہ کھائی میں گرنے کے مقدر کو بھی انہوں نے لطف و مسرت کی ایک کیفیت سمجھ لیا ہے اور زوال کے نشے میں مخمور اس میلے میں ہر کوئی اپنے اپنے خواب، خیال اور کام میں ایسا گم ہے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں، خبر ہے تو یہ کہ کوئی اس سے آگے نہ نکل جائے۔

میلے میں کئی چھوٹے بڑے پنڈال ہیں، جن میں رنگا رنگ تماشے دکھائے جا رہے ہیں، دیکھنے والے خود ہی تماشائی ہیں، خود ہی تماشا اور خود ہی تماشا دکھانے والے، اس لئے معلوم نہیں ہونے پاتا کہ کون کیا ہے۔ کون داد دے رہا ہے اور کون وصول کر رہا ہے، یہ ایک ایسا طلسم ہے جسے کسی سامری نے نہیں بنایا بلکہ خود اس کے اسیروں نے بنایا ہے۔ بنایا اور پھر خود اس کے طلسم میں جکڑے گئے۔ اب انہیں پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھنا پڑتا، پتھر ان کے اپنے وجود میں جکڑ پکڑ چکا ہے۔ اندر ہی اندر پھیلتا ہے اور آہستہ آہستہ وجود کے سارے حسی حصوں کو پتھراتا چلا جاتا ہے، صرف آنکھیں جاگتی ہیں، دیکھتی ہیں مگر بولتی نہیں کہ آنکھوں کو بولنے کے لئے جس جذبے کی ضرورت ہے اس کے سوتے بھی پتھرا کر خشک ہو چکے ہیں۔

میلے میں خوب شور ہے ہر کوئی بڑھ چڑھ کر اس میں شریک ہے اور گزرتے

ایک ایک لمحے سے پورا حظ اٹھانا چاہتا ہے۔ درویش و سلطان و دانشور ہم پیالہ و ہم مشرب ہیں' اور محفل میں ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں۔ دانشور کا کہنا ہے کہ یہ اس کا قلم کا کمال ہے کہ اس نے سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔ درویش اسے اپنے فقر کا معجزہ سمجھتا ہے اور سلطان اسے اپنی فیاضی و حکمت گردانتا ہے۔ باہر کچھ بھوکے جن کی انتڑیاں سوکھ کر جلد سے جا لگی ہیں' دربانوں سے دست و گریباں ہیں۔ شور سن کر سلطان نے وجہ جانی تو اسے بتایا گیا کہ کچھ بھوکے روٹی کی طلب میں قصر شاہی کی دیواروں سے لپٹ رہے ہیں۔ اس پر سلطان نے خندہ کیا اور درویش سے کہا۔۔۔۔ "تم نے لوگوں کو جو صبر کا سبق دیا ہے اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے"

درویش نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔۔۔ "نہیں یہ بات نہیں۔۔۔۔۔ میرے درس میں کوئی کمی نہیں' ہاں دانشور کے لفظوں میں ابھی پورا سکون پیدا نہیں ہوا۔"

دانشور نے کن انکھیوں سے درویش کو دیکھا' پھر سلطان کے رویے کا اندازہ کیا اور کہنے لگا۔۔۔ "میرے قلم نے تو مدت ہوئی احتجاج کا لفظ ہی نہیں لکھا۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔"

سلطان کے چہرے پر بکھرا ہوا تردد سمٹنے لگا۔۔۔ "ہاں یہ تو ہے۔۔۔۔ لیکن کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

پھر اس نے سپہ سالار کی طرف دیکھا۔۔۔۔ "تمہاری تلواروں کی چمک تو کہیں ماند نہیں پڑ گئی"

سالار نے تیزی سے نیام میں سے تلوار نکالی۔ تیز روشنی میں یوں لگا جیسے بجلی کا کوندا لپک گیا ہو۔ سالار نے اسی تیزی سے تلوار کو نیام میں رکھا اور بولا۔۔۔ "تلواروں کی چمک تو پہلے سے بھی تیز ہے"

"پھر۔۔۔۔۔۔ کیا وجہ ہے؟" سلطان کے چہرے پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔۔۔ "کیا وجہ ہے؟" "شاید میلے میں دلچسپی کا سامان کچھ ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں کچھ نئے آئٹم شامل کرنا چاہئیں" دانشور نے مشورہ دیا۔ سلطان نے تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔ "خوب۔۔۔ بہت خوب"

"تو پھر کون سے نئے آئٹم شامل ہونا چاہئیں" سلطان نے درویش کی طرف دیکھا۔

سب سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھائے اور پھر ایک طرف سے ایک شخص اور دوسری طرف سے دوسرا شخص نمودار ہوا۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے بحث کرتے رہے کہ اس وقت رات ہے یا دن۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں کے گرد ایک ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ہجوم ایک دوسرے پر پل پڑے اور سارا منظر میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا۔

یہ ڈرامہ میلے کے جس پنڈال کے سٹیج پر دکھایا جا رہا تھا۔ وہاں سب سے زیادہ رش تھا۔ میدان جنگ کے منظر میں جونہی تیزی آئی لوگوں کے جذبوں میں بھی شدت آ گئی۔ کہیں وسط میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اسی جذباتی کیفیت میں ساتھ والے کو کہنی مار دی۔ ساتھ والے نے کہنی مارنے والے کو کرسی سے گرا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ پنڈال میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے طرفدار بھی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک شور تھا کہ آسمان سر پر اٹھ گیا۔

ساتھ والے پنڈال میں موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا۔ گیت کی مدھر دھن پر مست حاضرین نے چونک کر ان بے ہنگم آوازوں کو سنا' ساتھ والے پنڈال کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا اور شانے ہلا کر پھر گیت کی مدھر تانوں میں ڈوب گئے۔

اگلے اس سے اگلے اور اس سے بھی اگلے پنڈال میں ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ سر اٹھایا بے ہنگم آوازوں کو سنا اور پھر اپنی اپنی تانوں اور سروں میں ڈوب گئے۔

شور' ہنگامے اور مستی و سرور میں یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ باہر سے بھی کوئی اندر گھس آئے ہیں اور مارنے والے اپنے نہیں باہر کے لوگ ہیں۔

میلے میں قتل و غارت کا ایک بازار گرم ہے۔ سر کٹ کٹ کر نیچے گر رہے ہیں لیکن مستی و سرور میں سرشار کسی کو اندازہ نہیں کہ مارنے والے کون ہیں اور

کب اندر آئے ہیں؟

یہ رات کا آخری پہر ہے' میلہ تو لٹ چکا لیکن زوال کے نشے میں مخمور' ڈھلوان پر سفر اور ناسفری کی حالت میں' اپنے اپنے خوابوں' خیالوں اور کاموں میں ایسے گم ہیں کہ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے کہ چل رہے ہیں یا کھڑے ہیں' کھڑے ہیں یا چل رہے ہیں'

اور شاید یہ جاننے کی خواہش بھی نہیں!

2

گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑے وہ جب بستی کی طرف سرپٹ چلے آتے تھے تو خون بہانے اور عورتوں کے گدگداتے بدنوں کی لذت کا تصور ان کے جسموں میں انگڑائیاں لیتا تھا۔ زوال کے نشے میں سرشار اسی بستی کے بارے میں ان کے مخبروں نے بتایا تھا کہ وہاں کی عورتیں خوب پلی ہوئی اور اٹھکیلیاں کرتی ہیں۔ مرد لالچ اور حسد کے حصار میں بند اپنے کاموں سے اس طرح چپک گئے ہیں کہ انہیں اپنے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ درس گاہوں میں کتاب کی بجائے ڈنڈے اور ہتھیار آ گئے ہیں۔ انصاف گاہوں میں عدل کی روایت ختم ہو گئی ہے اور منصف پیسے لے کر فیصلے کرتے ہیں۔ دربار میں باہمی مشاورت کی بجائے ایک دوسرے پر آوازیں کسی جاتی ہیں۔ خلیفہ لذتوں کے نشے میں سرشار ہے۔ اسے اپنے محل سے باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ عبادت گاہیں بحثوں کا اکھاڑہ بن گئی ہیں اور وہاں سے نفاق کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور وہاں کے لوگ' وہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن یوں بے نیازی سے شانے ہلاتے ہیں جیسے سب کچھ ان کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اپنا زوال ان کے لئے گفتگو کا پسندیدہ موضوع اور لذت کا ایک ذریعہ ہے۔

مخبروں نے اس بستی کا ذکر کچھ اس طرح کیا اور ان کی پلی ہوئی عورتوں اور شان و شوکت کی ایسی تصویر کھینچی کہ وہ بے چین ہو' اچھل کر گھوڑوں کی ننگی

پٹھوں پر جا بیٹھے اور سرپٹ اس بستی کی طرف چل نکلے۔ بستی کی پلی ہوئی اٹھکیلیاں کرتی عودتوں اور بھرے پرے بازاروں کی مہک انہیں اڑائے لئے جاتی تھی۔

شام کے وقت جب وہ دریا کنارے پہنچے جس کے دوسرے کنارے بستی آباد تھی تو رات وہیں قیام کرنے کی ٹھانی۔ گھوڑوں سے اتر کر کریں سیدھی کیں اور رات کے کھانے کے ہلئے کچھ جانور ذبح کئے۔ بھنتے گوشت کی مہک ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچی۔ بستی والے اپنے نشے میں سرشار' گلیوں اور بازاروں میں مست اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مرد دکانوں پر بیٹھے تجوریوں میں جمع دن بھر کی کمائی گن رہے تھے اور عورتیں سنگھار میزوں پر بیٹھی رات کی محفلوں کے لئے تیار ہو رہی تھیں۔ ان کے پلے ہوئے جسم سرسراتے ریشمی لباسوں میں سے چھلک رہے تھے۔

خلیفہ جس کے محل کی ایک بالکونی دریا کی طرف کھلتی تھی اپنے مصاحبین میں بیٹھا نئے منصوبوں پر گفتگو کر رہا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے بھنتے گوشت کی مہک لہروں پر تیرتی محل کی بالکونی تک آ پہنچی۔ خلیفہ نے مہک کو محسوس کیا اور بالکونی میں آن کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے مشعلوں کا ایک کارواں حرکت کر رہا تھا۔ اس نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا اور ایک مصاحب سے پوچھا۔۔۔۔ "یہ کیا ہے؟"

مصاحب نے دست بستہ عرض کیا۔ "حضور! یہ جنگلی لوگ ہیں۔"

"لیکن یہاں کیوں آئے ہیں؟" خلیفہ کو تشویش ہوئی۔

"حضور! یہ اپنی شہزادی آپ کے حرم میں دینا چاہتے ہیں۔"

خلیفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ جنگلی بدن کی کچی خوشبو نے اس کے اندر لذت کی پھلجڑی چھوڑی۔ اس نے اطمینان سے سرہلایا اور بولا۔۔۔ "لیکن یہ مہک۔۔۔۔ گوشت بھوننے کی یہ مہک کیسی؟"

مصاحبین نے ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اور ان میں سے ایک بولا۔۔۔ "حضور! یہ لوگ کباب تیار کر رہے ہیں تاکہ صبح جب شہزادی کو

آپ کے حضور پیش کیا جائے تو سارے شہر کی دعوت بھی کی جائے۔"
خلیفہ بے تابی سے مسکرایا اور پوچھا----- "دن طلوع ہونے میں ابھی کتنا وقت ہے؟"
صبح سویرے جب ان کی عبادت گاہوں میں خوش الحانی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح بستی پر ٹوٹ پڑے اور-------؟
برسوں پہلے تاریخ میں پڑھا ہوا یہ واقعہ ان دنوں مجھے بار بار یاد آ رہا ہے۔ شہر کے گلی کوچوں میں ایک والہانہ رقص جاری ہے۔ زوال کے نشے میں سرشار لوگ اپنے اپنے خول میں بند ہیں۔ اپنے اپنے نشے میں مست، تخت پر بیٹھا ہوا شخص اپنے مصاحبین میں گھرا اپنی لذتوں اور اپنے منصوبوں کے حصار میں قید، اور-----اور-----اور

سمندر کے دوسرے کنارے سے بھنتے گوشت کی مہک لہروں پر چلتی آہستہ آہستہ شہر میں پھیل رہی ہے۔ لیکن محل کی بالکنی بند ہے اور زوال کے نشے میں سرشار لوگ اپنے اپنے خول کی لذت میں محصور!
میری گواہی پر کون یقین کرے گا؟

3

دشوار گزار پہاڑوں کی دیواروں میں قید یہ بستی پچھلے کئی برسوں سے مر رہی ہے۔

اس کی فضاؤں میں ایک ایسا کینسر پھیل گیا ہے کہ بظاہر ہر شے تر و تازہ لگ رہی ہے لیکن اندر ہی اندر مرجھا رہی ہے۔ لوگ اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، اس موضوع پر گھنٹوں بحث بھی کرتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے، کچھ کرنا چاہتے ہی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ساری بستی کسی نادیدہ طلسم میں مقید ہے۔ چاروں طرف ایک ہو ہو ہاؤ ہے۔ تیز تیز چلنے کے منظر، قہقہے اور رونق، لیکن ایک نامعلوم سی چپ اور سناٹا ہے جو ان سب کے اندر کہیں موجود ہے، جسے محسوس تو کیا جاتا

ہے لیکن دیکھا نہیں جا سکتا۔ چیزیں افراط سے ہیں لیکن صرف چند لوگوں کے لئے۔ نعمتیں طرح طرح کی لیکن ذائقوں سے خالی۔ حرکت تیز تر مگر عمل سے تہی۔ سوچ موجود لیکن بے سمت۔ کوئی نہ کوئی اس سارے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہا ہے۔ ہر صبح اپنے ساتھ دریا کی لہروں کی طرح اداسی کی ایک نئی تہہ لے کر آتی ہے اور لوگ اندر ہی اندر مرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ بستی زندہ لوگوں کا قبرستان بنتی جا رہی ہے۔ اس کی ہولناکی سے گھبرا کر کچھ لوگ ہجرت بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن دشوار گزار پہاڑوں کی دیواریں راستہ نہیں دیتیں۔

تو کیا ان کا مقدر یہیں سسک سسک کر مرنا ہے؟

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں کہ آنکھیں کھلی ہونے کا دعویٰ کر کے سوئے رہنے کا شاید یہی انجام ہے۔ دیواروں کے یہ حصار بھی ان کے اپنے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ سنانے والے یہ کہتے ہیں کہ کبھی یہ بستی بھی کھلی فضاؤں میں سانس لیتی تھی۔ خود کو دوسروں سے علیحدہ کرنے کا تصور خود انہی کے ذہنوں میں پیدا ہوا تھا اور پھر آہستہ آہستہ ایک نادیدہ حصار ان کے گرد تعمیر ہوتا چلا گیا جو اب ان دشوار گزار پہاڑوں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ان دیواروں کے درمیاں مقید ہو کر ہوا کی رفتار ست پڑنے لگی۔ اس میں ٹھہراؤ آگیا اور ایسے ہی کسی ٹھہرے ہوئے لمحے میں ایک پتھر نے جنم لیا جو آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا اور اب ساری فضا پتھر ہے۔ ایک نہ ٹوٹنے والا منجمد پتھر منظر!

اس منجمد منظر میں سانس تو لے رہے ہیں لیکن زندگی کی گرماہٹ نہیں۔ سینوں کا زیر و بم تو محسوس ہوتا ہے لیکن حرکت میں ایک عجب بے بسی ہے کہ بستی کی فضاؤں میں ایک کینسر پھیل گیا ہے جس سے ساری بستی اندر ہی اندر مر رہی ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں، سو اس بے بسی میں بھی ایک لذت آگئی ہے۔

بے بسی کی لذت میں گرفتار یہ بستی کفارہ ادا کرنا نہیں جانتی۔ اس کے لئے تو ایک دفعہ مر کر دوبارہ جینا پڑتا ہے۔ اس دوبارہ جینے کے لئے اسرافیل جیسے صور کی

ضرورت ہے اور میرے پاس اتنی طاقت نہیں، لیکن پھر بھی میں چیخ رہا ہوں کہ شاید اس ہنگامے اور شور میں میری آواز کسی کان میں پڑ ہی جائے۔

تمنا کا دوسرا قدم

پھر وہی پچھتاوا کہ گھر سے نکلنے میں چند لمحے کی دیر ہو جاتی تو اس نقصان سے بچا جا سکتا تھا۔ وہ جس وقت ویگن سٹاپ پر پہنچا ویگن رینگ چکی تھی' لیکن اس نے جانے کیسے اسے دیکھ لیا اور چلتی ویگن سے اتر آیا۔ وہی پرانی داستان اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جب سے ہزار روپے نکل گئے۔ اس میں بولڈ نیس کی کمی اب پرانی بات تھی اور اسے بدلنا اس کے بس میں نہیں تھا کہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی عاداتیں اور جبلتیں نہیں بدلتیں۔ رہ دے کے یہی کہا جاسکتا تھا کہ کاش اسے گھر سے نکلنے میں چند لمحوں کی تاخیر ہو جاتی اور ویگن سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے ویگن نکل چکی ہوتی یا پھر وہ ذرا سا بولڈ ہو کر انکار کر دیتا کہ اس کے پاس اس وقت کچھ نہیں وہ اس کی تلاشی لینے سے تو رہا تھا۔ لیکن ہر شے اپنی اپنی ترتیب سے ہوئی اور اس کے حصے میں حسب معمول پچھتاوا ہی آیا۔ یہ پچھتاوا اس کا مقدر تھا' اب پرسوں ہی کی بات ہے آتے ہوئے اس موڑ پر جہاں اس کے گھر کو دو راستے جاتے تھے لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکا اور پھر بائیں طرف مڑ گیا۔ ابھی تھوڑی دور ہی نکلا تھا کہ سامنے سے آتی تیز موٹر سائیکل توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اس کے دائیں طرف آن لگی۔ بک بک اور اصول ضابطے کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ موٹر سائیکل والا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں طرف کا بمپر ٹھیک کرانے میں سات آٹھ سو نکل گئے۔ خیال آیا کہ اگر وہ موڑ پر بائیں کی بجائے دائیں مڑ گیا ہوتا تو یہ واقعہ پیش نہ آتا' پھر وہی پچھتاوا۔

ہر پچھتاوا کے بعد جی چاہتا تھا کہ وقت کی قبر سے کسی ایک لمحے کو اٹھا کر واپس اپنی جگہ رکھا جائے اور دوبارہ سے سمت یا فیصلے کا تعین کیا جائے۔ کبھی کبھی بیوی سے تکرار کا دورانیہ طویل ہو جاتا تو اس لمحے کی تلاش ہوتی جو اب وقت کے ملبے میں دور کہیں دبا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس کی ماں نے کئی لڑکیاں دیکھی تھیں' کچھ پسند بھی آئی تھیں لیکن یہاں بات پکی ہو گئی۔ اب اس ایک لمحے کو ماضی

کے دھند لکوں سے نکال کر دوبارہ اپنی جگہ رکھا جاسکتا تو وہ کیا فیصلہ کرتا۔ ایک دو جگہ جو انکار کیا تھا شاید وہ نہ کرتا' یوں زندگی کا سارا سفر ہی بدل جاتا۔ رستہ بدلنے سے منظر ہی نہیں بدلتے سود و زیاں کے سلسلے بھی اور سے اور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ لمحہ تو اب ماضی کے مزار میں اتنی گہرائی میں دفن ہے کہ اسے نکالنا ممکن نہیں۔

وہ سوچتا چلو یہ تو ہوگیا۔ کسی نہ کسی راستے پر تو چلنا ہی تھا' لیکن اس سے بھی پہلے اگر وہ اس لمحے کو وقت کے صحرا میں کہیں تلاش کرپاتا اور دوبارہ اپنی جگہ لے آتا' جب اس نے ملازمت کا آغاز کیا تھا تو اس کی زندگی کا سارا رخ ہی بدل گیا ہوتا۔ ملازمت کے لئے کئی جگہ انٹرویو دیئے تھے۔ دو تین جگہوں سے کال آگئی۔ پہلی کال ایک کالج سے آئی اس نے وہیں جوائن کر لیا۔ دوسری کال دو دن بعد آئی۔ اگر دو دن پہلے آجاتی تو وہ پڑھانے کی بجائے ٹیکس کے اس محکمے میں لاکھوں کما چکا ہوتا لیکن دو دن کے وقفے نے ساری صورت ہی بدل ڈالی تھی۔ تدریس کے شعبے نے اسے ذہنی طور پر بڑا مالدار بنا دیا تھا لیکن جیبیں ساری عمر خالی رہیں۔ بس وقت کی ذرا سی تبدیلی نے ساری ڈگر ہی بدل ڈالی تھی۔ لیکن اب برسوں پیچھے رہ گئے ڈھول اٹے راستے پر اس لمحے کو تلاش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ یہ لمحہ مل جاتا تو وہ اسے آگے پیچھے کر دیتا۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے لمحے تو سینکڑوں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ جنہیں وہ آگے پیچھے کرنا چاہتا تھا' یا انہیں واپس اپنی جگہ لاکر سفر کے آغاز یا ارادے میں تبدیلی کا خواہاں تھا' لیکن وقت کے اس گرانڈیل انبار میں دبے ہوئے یہ لمحے اس کی دسترس سے باہر تھے' بس ان کی یادیں اور شبیہیں ہیں۔ کچھ دھند لکے تھے' خواب اور حقیقت میں ملے جلے کچھ خیال۔ واپسی کا سفر دھند' گہری دھند میں تھا اور مڑنا ناممکن۔ پس آگے ہی جایا جاسکتا ہے' بغیر ارادے' بغیر فیصلے کے اور فیصلے اور ارادے کے لمحے تو گزر چکے' اس وقت' ایک خاص لمحے میں ذرا سی تبدیلی کیا سے کیا کر دیتی۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ آسمانوں سے جب اس کی روح کا سفر شروع ہوا تو کرہ ارض کی طرف آتے ہوئے ذرا رخ مڑ جاتا تو اس ملک کی بجائے کسی بھی دوسرے ملک میں ---- ساری البم ہی اور ہو جاتی' تصویروں کے انداز ہی بدل جاتے' یا چلئے اگر اسی ملک میں آنا تھا تو کسی دوسرے شہر میں' کسی دوسری کوکھ میں' اس تنگ و تاریک خول میں سانس لینے کی تمنا' اس کی

اپنی مرضی شامل تھی؟ معلوم ہیں' اب تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ آسمانوں سے ہجرت کے رخ یا وقت میں ذرا سی تبدیلی ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ ازل اور ابد کے درمیان اس وسیع و عریض سفید کاغذ پر پھیلے یہ نقطے' یہ تگ و دو کیا ہے؟ ہابیل و قابیل اس ایک لمحے میں آمنے سامنے نہ آتے' ایک کو ذرا سی دیر ہو جاتی تو اس کا بھائی اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ یوں جائیداد کا بٹوارہ نہ ہوتا۔ سب اسی ایک حویلی میں مل جل کر رہتے۔ شام کو وہی محفل جمتی۔ دادی ماں پریوں کی کہانی سناتی اور سارے بچے کہانی کی پینگ پر جھولتے خوابوں کی وادیوں میں اتر جاتے لیکن اس ایک لمحے میں ہابیل و قابیل آمنے سامنے آگئے۔ آگئے تھے تو فیصلے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی۔ ہونی کا لمحہ ٹل جاتا۔ ٹلنے کو تو وہ لمحہ بھی ٹل سکتا تھا جب اس کے جدامجد نے ممنوعہ شجر سے پھل توڑا تھا۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی یا ذرا سا سوچ لیا جاتا' سارا منظرنامہ ہی بدل جاتا۔ یہ تگ دود' یہ مرنا جینا' یہ خواب و حقیقت' لیکن اس سے بھی پہلے اس لمحے جب مٹی کے کلبوت میں پھونکا جارہا تھا' ایک انکار----- بس ذرا سی جرات ہی چاہئے تھی نا۔ چلئے اس سے انکار نہ ہو سکا تو دوسرا ہی انکار نہ کرتا تو یہ سارا فساد ہی ختم ہوتا۔ یہ تضاد' یہ جرات کی کمی' بس یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ ایک لمحے کا جو تیزی سے وقت کی قبر میں گم ہوا جاتا ہے۔ بس اسی ایک لمحے کو واپس لانے کی خواہش اپنی جگہ رکھ کر دوبارہ فیصلہ کرنے اور سفر شروع کرنے کی تمنا----- بس وہ لمحہ یہ لمحہ' بریک پوری شدت سے لگی۔ اس کا سرونڈ سکرین سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سکول بیگ پہنے ایک ننھا منا سا گول مٹول بچہ تیزی سے فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے سوچا اگر ایک لمحہ ادھر ہوتا تو یہ پیارا سا بچہ----- ایک نامحسوس اذیت اس کے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ تو سارے لمحے ملے جلے نہیں' انہیں وقت کی قبر سے چن چن کر اٹھانے اور اپنی جگہ رکھنے کی کوشش بے فائدہ ہے۔ اس نے نفی میں سرہلایا اور ونڈ سکرین پر نظریں جمائے خاموش سڑک کو دیکھتا رہا----- یہی سفر ہے ایک لمحے سے دوسرے لمحے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تمنا----- بس ایک تمنا ہے' ایک ایسی خواہش جو ہمیشہ رہے گی لیکن کبھی پوری نہیں ہوگی اور اگر پوری ہو گئی تو------؟

یخ بستہ شام

دستک کی دھیمی دھیمی صدا آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حرکت ہوئی کہ اب اس کے جسم میں صرف آنکھیں ہی متحرک تھیں' سرمئی اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ بس دستک کی مسلسل آواز کانوں کے راستے دل میں اترتی رہی' پھر لمحہ بھر کے لئے آواز رک گئی اور ایک بچے کی معصوم آواز ابھری---- "دروازہ کھولیں----- پلیز دروازہ کھولیں۔"

اس نے کروٹ لے کر آواز کی سمت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن جسم نے حرکت نہ کی' بس ایک لہر سی اٹھ کر رہ گئی۔

"دروازہ کھولیں----- پلیز" معصوم آواز میں ایک التجا تھی اس نے چاہا کہ کسی کو پکارے لیکن لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ آواز نہ نکلی۔

"پلیز----- دروازہ کھولیں' مجھے سردی لگ رہی ہے"

اسے لگا جیسے ایک ٹھنڈی لہر اس کے سارے بدن میں اتر گئی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی لیکن فالج زدہ جسم مٹی کے ڈھیر کی طرح اسی طرح پڑا رہا۔

"دروازہ کھولیں----- مجھے" آواز میں شامل کپکپاہٹ سردی کی شدت کا احساس دلا رہی تھی۔

اس نے اپنی ساری توانائیاں اکٹھی کر کے آواز دینے کی کوشش کی لیکن آواز ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ سے آگے نہ بڑھی۔

کوئی بھی نہیں سن رہا--- کوئی بھی نہیں سنتا۔ اس نے اپنے اندر ہی اندر کسی سے کہا۔

سرمئی اندھیرے میں رچی ٹھنڈک اس کے سارے جسم کو تھپک رہی تھی۔

"پلیز---- کھولیں" بچے کی آواز میں گڑگڑاہٹ اور عاجزانہ نمی پیدا ہو گئی تھی۔

اس نے آنکھوں کی حرکت سے آس پاس کو ٹٹولا لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

دستک کی آواز پھر ابھری اور تا دیر مسلسل سنائی دیتی رہی۔ پھر دستک کی کوکھ سے ایک درد بھری سسکی ابھری اور آواز آئی----- "پلیز---- کھولیں"

آواز میں ایک بے بسی' مایوسی اور دکھ شامل تھا' پھر یوں لگا جیسے کوئی دیوانہ وار دستکیں دیئے جاتا ہے----- مسلسل نہ تھمنے والی دستک۔

اس کے وجود کے اندر کہیں ایک گرم سا نقطہ پیدا ہوا اور تیزی سے پھیلنے لگا' یوں لگا جیسے وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ سکے گا لیکن تمام کوششوں کے باوجود جسم کے ایک عضو نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ تیزی سے پھیلتا نقطہ آہستہ آہستہ تیز نکیلی ٹھنڈک میں تبدیل ہو گیا۔

دستک تھم گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر وہی معصوم مایوس آواز کانوں کو چیرتی اس کے اندر آنے لگی---- "پلیز---- دروازہ کھولیں' پلیز" تکرار سے یہی جملہ دہرایا جاتا رہا' پھر چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے کوئی سسکیاں لے رہا ہے۔

"مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے----- پلیز"

تیز نکیلی ٹھنڈک اس کے وجود کو ادھیڑنے لگی۔

"کوئی نہیں سنتا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لمحہ بھر کے لئے یوں لگا۔ جیسے وہ خود دروازے پر کھڑا ہے اور دستکیں دے رہا ہے۔

"دروازہ کھولیں---- مجھے"

ٹھنڈی لہریں پورے وجود پر دوڑ رہی تھیں۔

"مجھے----"

اس کے لب ہلے لیکن آواز نہ نکلی۔

"کوئی نہیں سنتا---- یہ سب کہاں چلے گئے ہیں؟"

"مجھے ٹھنڈ-----"

اس نے آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"یہ سب کہاں------؟"

مایوسی اداسی اور دکھ سے پور پور بھیگ گیا----- "سب مجھے چھوڑ گئے ہیں"

دستک کی آواز پھر ابھری تادیر سنائی دیتی رہی پھر معصوم مایوس اور اداس آواز ابھری----- "دروازہ کھولیں----- پلیز دروازہ کھولیں۔"

"میری آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی" ہلتے ہونٹ آہستہ آہستہ ساکت ہو گئے۔

سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ یوں لگا جیسے پاؤں کی طرف سے ایک یخ پتھر تیزی سے اوپر کی طرف پھیل رہا ہے۔

دستک کی آواز میں نقاہت آ گئی جیسے دستک دینے والے کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔

"دروا------ زہ------ کھو-----" آواز ٹوٹ گئی۔

اس نے اپنے وجود میں پھیلتے یخ پتھر کو پھیلنے سے روکنے کی آخری کوشش کی لیکن جسم کے کسی عضو میں شمہ بھر حرکت نہ ہوئی۔

"دروا---- زہ" اس نے پوری قوت سے چیخنا چاہا لیکن اس بار ہونٹوں کے کونے بھی نہ پھڑپھڑائے۔ آنکھیں گھما کر کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن لگا جیسے آنکھوں کے کونے بھی پتھر ہوئے جا رہے ہیں۔

"تو-----" لیکن آگے سوچنے سے پہلے ہی لفظ تڑخ گئے دستک کی مدھم سی آواز لمحہ بھر کے لئے ابھری پھر ایک دم صدا سنائی دی---- در---- وا---- ٹھن---- ڈ" چھت سے بھی اونچی سرد لہر نے اس کے سارے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اس کے اندر پھیلتا یخ پتھر آنکھوں میں اتر آیا۔ پتھرائی آنکھوں سے لمحہ بھر کے لئے بس یہ دیکھ سکا کہ وہ سرد لہر کی تہہ میں ڈوبا جا رہا ہے۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ نرس اندر آئی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی

رہی۔ پھر قریب آ کر اس نے اس کی نبض ٹٹولی۔ چند لمحے چپ رہی پھر پیچھے مڑ کر
کسی سے کہنے لگی-----۔ "مجھے افسوس ہے------"

خالی ہاتھ شکاری اور تیز آہو

برکھا رت کے بے ایمان موسم نے عجب کافر سماں پیدا کر دیا تھا' آدھے آکاش پر گھنگھور گھٹا پائل باندھے رقص کر رہی تھی اور باقی کے آدھے آکاش پر ست رنگی دھنک کے نیم دائرے نے عجب طرح کی چمک پیدا کر دی تھی۔ لمحوں لمحوں سے پھوار پڑتی اور شیتل پون سبزے کی باس اور پھولوں کی خوشبو کو مٹھیوں میں بھر بھر کر چاروں طرف اچھال دیتی۔ ندی کی مچلتی خاموشی لمحہ بھر کے لئے کناروں کے بازوؤں میں جھولتی اور پھر ایک لمبی لہر بنا کر دوسری طرف نکل جاتی' کنارے کے ساتھ پڑے اونچے سے پتھر پر اداس بیٹھا وہ ایک ایک لہر کو گن رہا تھا۔

اس کافر موسم میں اس کے انتظار کی تپش میں ایک عجب مزہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس سمے جب رات قدم قدم ندی کی اور بڑھتی چلی آتی ہے اس کا آنا ممکن نہیں لیکن خواہش تھی کہ ست رنگی چڑیا کی طرح ایک ڈالی سے پھدک کر دوسری ڈالی پر جا بیٹھتی۔ وہ چاہا گیا تھا اور چاہنے والی ہمیشہ ہاتھوں کے کٹوروں میں تمنا کے پھول لے کر اس کے قدموں پر نچھاور کرنے آتی تھی لیکن اس کافر موسم میں بات کچھ اور ہو گئی تھی۔ وہ جو چاہا جاتا تھا آج خود چاہنے والا بن کر اس کی راہ تک رہا تھا آج سے پہلے اسے اس طرح کی صورت کا سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ چاہنے کی طلب کیا شے ہے؟ آج پہلی بار وہ ایک اور ہی طرح کی لذت سے آشنا ہوا تھا۔

موسم کافر تھا اور آسمان پر پائل بجاتی گھٹا اب باقی کے آدھے آسمان کی طرف بھی بڑھ رہی تھی۔ ست رنگی دھنک کے رنگ پیلے پڑ گئے تھے اور ندی کی بے چین لہریں ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف لوٹ رہی تھیں۔

وہ دوسرے کنارے ہی سے آتی تھی لیکن آج اس کا آنا ممکن نہ تھا۔ شاید

ناؤ ہی نہ ملے یا یہ کہ موسم کے کافرپن میں جو ایک تندی سی آچلی تھی وہ نہ آنے دے اس نے ٹھنڈی سانس لی اور پاس پڑے ایک کنکر کو اٹھا کر ندی میں پھینک دیا۔ لحوں کے دائرے میں کنکر پلک جھپکتے تہہ میں اتر گیا۔

"تو آج وہ نہیں آئے گی" اس نے اپنے آپ سے کہا اور اسے لگا کہ خواہش بھی ایک منہ زور گھوڑے کی طرح ہے۔

انتظار کے اس الاؤ میں پل پل سلگنے کی بھی اپنی ایک لذت ہے' ایک بولتی تنہائی' جس کے معنی تو ہیں لیکن آواز نہیں۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" اس نے خود سے کہا اور مڑ کر دیکھا۔

کوئی تھا---- لیکن وہ نہیں جس کے چاہ کی لگن الاؤ بنی جا رہی تھی۔

"آپ اداس کیوں ہیں؟" وہ دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

وہ مسکرایا' لیکن اسے خود احساس ہوا کہ یہ مسکراہٹ نہیں۔

"میں اس کا کارن جانتی ہوں" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ کچھ نہ بولا' بس چپ چاپ اسے دیکھا کیا۔

"میں اپائے کرتی ہوں"

"کیسے؟"

"جاتی ہوں اور اسے ساتھ لے کر آتی ہوں"

"اس موسم' اس رات میں" اس کی حیرت بڑھ گئی---- "اور---- اور پھر اپنی سوکن کو"

اندھیرے نے چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کالی گھٹا سارے آکاش پر چھا گئی تھی اور ندی کی لہروں میں خوفناک تندی آگئی تھی۔"

"اس موسم' اس رات میں' اس نے اپنی بات دہرائی---- " اور---- اور پھر اپنی سوکن کو"

"ہاں" وہ یقین سے بولی---- "آپ کی اداسی دیکھی نہیں جاتی---- اور پریم میں دوئی نہیں ہوتی یکتائی ہوتی ہے"

اسے لگا آج عجیب حیرتوں اور جذبوں سے آشنا ہونے کا دن ہے۔ آج وہ

پہلی بار برہا کے دکھ سے واقف ہوا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ انتظار کی لذت کیا ہے اور آج ہی وہ اس جذبے سے بھی آشنا ہوا کہ جسے چاہا جائے وہی سب کچھ ہے----
یہ جو سامنے کھڑی تھی' یہ بھی اس کی چاہنے والی تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کی بیاہتا تھی۔ لیکن اس کی خوشی کے لئے یہ سہاگن' سوکن کو لانے چلی تھی۔

"یہ کیا ہے----- یہ کون سا جذبہ 'کون سی کیفیت ہے؟" اس نے خود سے پوچھا---- "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا"

"آگیا دیجئے" وہ بنتی کرتی ہے۔

"میں تو صرف چاہے جانے کے غرور ہی سے واقف ہوں' یہ خودسپردگی کا عجز کیسا ہے؟"

وہ ہاتھ باندھے باندھے پیچھے ہٹتی چلی جاتی ہے اور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر ندی پار نکل جاتی ہے۔

اب موسم کافر نہیں رہا' اس میں تندی اور تیزی آگئی ہے۔ تیز ہوا میں ندی کنارے کے ہلتے درخت عجب ڈراؤنی آوازیں نکالتے ہیں۔ سیاہ رات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح چاروں طرف چھاگئی ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جو اس کی بیاہتا ہے اپنی سوکن کو لانے چلی ہے اور وہ جو سب کچھ جاننے والا سمجھا جاتا ہے' صرف چاہے جانے کے غرور ہی سے آشنا ہے' اسے اپنے آپ سے گھن آتی ہے۔ چاہے جانے کے غرور نے میری طاقت کو مٹی کر دیا ہے اور خود سپردگی کے عجز نے اس کمزور عورت کو کیا بنا دیا ہے؟ وہ بے چین ہو گیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے اندر سے پچھاڑ دیا ہو۔ سارا وجود ریت کی دیوار کی طرح بکھر گیا۔ بڑی مشکلوں سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ندی کنارے چلتا جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔

جنگل ماتا کی طرح ہے جو سب کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ وہ جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی سوکن کو لانے نکلی تھی جنگل کے طوفان میں کہیں کھو گئی اور وہ جو اس روز گیان کی ایک نئی منزل سے آشنا ہوا تھا---- وہ بھی جنگل میں ایسا گم ہوا کہ لوٹ کر نہ آیا۔

صبح کو صرف وہ آئی جس کا یہ سارا تماشا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ندی کنارے اسی پتھر پر جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا ایک تازہ کھلا ہوا پھول پڑا ہے جو رات کے خوفناک طوفان کے بعد بھی اسی طرح تروتازہ اور محفوظ ہے۔

وہ ہر روز اسی جگہ اس کا انتظار کرتی ہے لیکن نہ اس کا کچھ اتہ پتہ ہے نہ اس کا جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے لینے گئی تھی' لوگ ان کے گم ہو جانے کی طرح طرح کی کہانیاں سناتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ خاک ہو جانے میں جو لذت ہے وہ کیا ہے اور خاک ہو کر مٹی میں مل جانا بھی ایک بات ہے کہ مٹی چاروں طرف موجود تو ہوتی ہے لیکن اپنی پہچان نہیں کراتی۔

الجھاؤ

راستہ تو دیکھا بھالا تھا' اور قدم ایک ایک نشیب و فراز کے نبض آشنا' آنکھیں بند کر کے بھی دوڑتا تو کہیں بھٹکنے کا خدشہ نہیں تھا' سفر آغازی سے ایک ایک نشانی اپنی پہچان رکھتی تھی' پہلے پہلے کوئی بل نہیں تھا۔ بائیں طرف پرانی جیل تھی' جس کی باہر والی دیوار اب جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی اور اس میں گزرنے کے کئی راستے بن گئے تھے۔ اسی ٹوٹی غمزدہ دیوار کے پیچھے بیرک نما عمارتیں تھیں جو اب کھنڈر بن گئی تھیں۔ ان عمارتوں کے آگے پیچھے ویران راستے تھے' جن پر اب جانور ہی گزرتے' کناروں پر اگی گھاس نے بنیادوں کو چھپا دیا تھا۔ کبھی ان راستوں پر بیڑیاں پہنے پاؤں کی چاپ گونجا کرتی تھی۔ بیرکوں کی دیواروں پر لگے سسکیوں کے نشان اب بہت مدھم پڑ گئے تھے۔ بیرکوں کے آگے ایک کھلا میدان تھا جس کے بیچو وبیچ پرانے پتھروں کا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر لگے کھمبے میں رسی کا ٹکڑا ابھی بھی لٹک رہا تھا' لیکن اب اس کے پھندے میں کچھ نہیں تھا۔ چبوترے کے پتھروں کی درزوں میں اگی گھاس اور کائی نے ایک حصار سا بنا لیا تھا۔ میدان مدتوں سے خالی تھا' نہ وہاں اب کوئی تماشا تھا' نہ تماشا دیکھنے والے۔ راتوں کو سائیں سائیں کرتی ہوا ٹوٹی دیواروں سے ٹکراتی تو ان میں دفن سسکیاں جاگ اٹھتیں' لیکن ان کی آواز سڑک تک نہ پہنچتی' سڑک پر چلنے والی ٹریفک اپنی مستی میں سر جھکائے' اسی چال سے چلتی رہتی۔ جیل کی لمبی دیوار ختم ہوتی تو چھوٹے چھوٹے گھروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا' درمیانے درجے کے ان گھروں میں اس جیسے دوسرے ملازم رہتے تھے۔ ان گھروں کے آخر میں ایک نالا تھا جس میں برائے نام ہی پانی بہتا' نالے کے دوسری طرف بڑے لوگوں کے بنگلے تھے۔ یہ نالا گویا ایک طرح کی حدبندی تھا جسے عبور کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ یہ سڑک کی ایک طرف تھی' دوسری طرف

درخت تھے۔ کہیں کہیں پھول تھے اور پرندوں کے کئی گھونسلے تھے۔ وہ اس طرف گیا ہی نہیں تھا اس لئے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان درختوں کے پرے کیا منظر تھا اور پرندوں کے چہچہانے میں کس طرح کی نغمگی تھی۔ اس کا سفر تو سڑک کے دنوں کناروں کے اندر اندر تھا۔ وہاں سے جو کچھ دکھائی دیتا وہی سچ تھا' آغاز سے اپنے گھر تک جیل کی عمرزدہ جگہ جگہ سے تڑخی دیوار کے ساتھ چلتے جانا' دوسرے موڑ پر مڑنا اور چھوٹے راستے کے بے مروت کنکروں پر قدم جمانے کی کوشش کرتے کرتے دہلیز پر پہنچ جانا' جس کے آگے دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک باورچی خانہ اور اسی سے ملا غسلخانہ جیسے ایک دوسرے سے ہم آغوش۔

اس کی دنیا صرف ایک کمرے تک محدود تھی' چھوٹی سی بے سلیقہ دنیا' دن بھر دفتر میں فائلوں کی بھول بھلیوں میں گم رہنا' کھانا اور ناشتہ کنٹین سے' کمرہ تو صرف سونے کے لئے تھا' اور لمبی سڑک' یہ بظاہر پرجوش لیکن اندر سے ویران سڑک اس کی طرح تنہا' یہی ان کی قدر مشترک تھی' رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ خاموشی سے گھر سے نکلتا اور سڑک کی انگلی تھامے' جیل کی عمرخوردہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا' باتیں کرتا چوک تک آتا' یہاں پرانی دیوار کو نابناتی دوسری طرف مڑ جاتی تھی۔ اسے دیوار پر حرکت کرتے سائے کچھ کہتے محسوس ہوتے لیکن ان کی آواز سنائی نہ دیتی۔ دیوار میں بنے ہوئے دروں سے کبھی کبھی کوئی پرندہ پھرپھڑا کر باہر نکلتا تو خاموشی کی گھنی چادر میں سوارخ سا ہو جاتا۔

"یہ بے کیف سی زندگی"۔ وہ سوچتا------ "کبھی اس کے اندر کے اندھیرے سے بھی کوئی پرندہ اسی طرح پھڑپھڑا کر نکلے اور کھلی فضا میں دور تک اڑاریاں مارتا ہوا نیلی فضاؤں میں گم ہو جائے۔ یہ نیلی فضائیں اپنی وسعتوں کے ساتھ بانہیں کھولے اسے اپنی طرح بلاتی تھیں' اس کا نام لیکر پکارتی تھیں' لیکن اس کے پاؤں تو اس سڑک سے بندھے ہوئے تھے۔ صبح ایک طرف سے جانا اور شام کو دوسری طرف سے آنا' اور پھر رات کی تاریکی میں خاموشی کی یہ گفتگو۔ کبھی اس کے اندر کوئی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیا کرتی تھی لیکن اب تو مدتوں سے کوئی آواز نہیں تھی۔ لگتا تھا اس کا وجود ایک قبر ہے جس کی تاریک گہرائی میں کوئی ننھا سا پرندہ دفن

ہے۔ اس نے سنا تھا دیوار کے دوسری طرف بیرکوں سے پرے میدان میں بھی ایک قبر ہے اور وہ چبوترا، جس کے کھمبے پر لٹکتا رسی کا پھند ------ کبھی کبھی اسے اپنے نام کی پکار سنائی دیتی۔ کوئی آہستہ آہستہ سے اس کا نام لیتا۔ جسم کی قبر میں دفن ننھا سا پرندہ لمحہ بھر کے لئے پھڑپھڑانے کی کوشش کرتا۔ میلے کاغذ پر کھنچی زندگی کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں ------ مدھم اور الجھی ہوئیں، صاف دکھائی نہیں دیتی۔ خاموشی اور اندھیرا ------ اور راستہ، بظاہر پرجوش لیکن اندر سے تنہا۔ یہ سڑک جس کے ساتھ ساتھ چلتی یہ بوسیدہ دیوار جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی ہے۔ اس میں کئی در ہیں، جن کے اندھیرے دروں سے نکلتا پھڑپھڑاتا پرندہ، بہت دنوں سے اب اس کے اندر بھی ہلکا سا ارتعاش ہو رہا ہے یوں لگتا ہے کوئی چیز کلبلا رہی ہے، شاید قبر میں مدتوں سے دفن پرندے کی روح طویل نیند کے بعد جاگ رہی ہے۔ اس کے پر پھڑپھڑانے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔

اس بظاہر پرجوش لیکن تنہا اداس سڑک کی انگلی تھامے بوسیدہ دیوار کے سائے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس کی خود کلامی میں تیزی آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس عمر خوردہ دیوار کے کسی روزن سے اندر جاکر سنسان بیرکوں میں سے ہوتا ہوا میدان میں نکل جائے اور پھر اس چبوترے تک ------ جس کے کھمبوں کی رسی کا پھندا مدتوں سے خالی ہے، روایت ہے کہ یہاں اسے سولی چڑھایا گیا تھا جو دوسروں کے لئے بولتا تھا اور جس کی آنکھیں سچ کہتی تھیں، اسے انہوں نے جن کے بوٹ بہت بھاری تھے اور کندھوں پر بندوقیں تھیں، کئی دن ان بیرکوں میں بند رکھا اور ایک رات چپکے سے، چبوترے پر لاکر پھندے میں پھنسا دیا، کئی دن اس کی گردن اس پھندے میں لٹکتی رہی، یہاں تک کہ سچ بولنے والی آنکھیں اور دوسروں کے لئے بولنے والی زبان باہر آگئی ------ اب مدتوں سے یہ پھندا خالی تھا، بیرکیں ویران ہوگئی تھیں اور اس سارے کو تحفظ دینے والی دیوار جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی اور اس میں کئی راستے بن گئے تھے ------ اس دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے اسے خیال آتا کہ رسی کے بل ابھی نہیں کھلے، گردن میں اکڑاہٹ سی محسوس ہوتی، جی چاہتا کہ کسی روزن سے اندر ------ اندر گہری تاریکی،

بیرکیں سنسان، درمیانی راستے ویران، خوف میں لپٹے قدم اٹھاتا وہ بیرک کے اندھیرے سے پھسل کر ویران اداس راستے پر آیا، ایک چمگادڑ چیختی ہوئی اڑ گئی۔ راستے کی گھاس میں ابھرے پتھر چمکتی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ اسے لگا وہ اپنی لمبی زبانوں سے، اس کے پاؤں دبوچنا چاہتے ہیں۔ تیز دوڑتا، ہانپتا ہوا میدان میں آنکلا۔ چبوترا سامنے تھا اور اس کے کھمبے میں لگے رسے کا پھندا جھول رہا تھا۔ اس کی سانسیں ایک دم معمول سے بھی نیچے آگئیں۔ قدم رک گئے جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ وہ جانے کتنی دیر آنکھ جھپکائے بغیر پھندے کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چبوترے کے قریب گیا۔ ٹوٹے پھوٹے تین چار زینے سوکھی گھاس میں دبے دبے سے تھے۔ وہ قدم قدم ان پر چڑھا اور پھندے کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتاً کسی نے پھندا اس کے گلے میں ڈالدیا۔ ایک تیز روشنی اس کے منہ پر پڑی اور تختہ اپنی جگہ سے کھسک گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی، ادھ کھلی آنکھوں نے اندھیرے کو اترتا دیکھا اور لمبی چپ ------!

ہسپتال میں اس کی عیادت کے لئے آنے والے اس کی باتیں سن کر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے اور تسلی کے ایک دو لفظ کہہ کر کمرے سے باہر آجاتے۔ اس کے ایک بہت ہی قریبی دوست کو جو مستقل اس کی تیمارداری کر رہا تھا، باہر آکر ایک ایک کو سرگوشی میں کہنا پڑتا---- "اب پرانی جیل کہاں ہے جی؟ وہاں تو مدتوں ہوئی چلڈرن پارک بن گیا ہوا ہے---- بس لگتا ہے ایکسیڈنٹ میں دماغ پر بھی کوئی چوٹ لگ گئی ہے۔"

اور سننے والا بڑی ہمدردی سے سرہلاتا------ "اللہ رحم کرے۔"

دشت کے ساتھ دشت ہونے کی لذت

رات کے پچھلے پہر یا پھر درمیانے پہر جب آنکھ کھلی تو ایک عجیب طرح کی پراسرار خاموشی آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر بستر میں لیٹا کچھ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن نہ کوئی آواز سنائی دی نہ کوئی حرکت دکھائی دی، سمجھ میں نہ آیا کہ ایکا ایکی آنکھ کھل گئی----- آنکھ کھلی بھی کہ یہ بھی کوئی خواب ہے، بس بے حس و حرکت بستر میں پڑا پڑا کبھی دروازے، کبھی کھڑکی کی طرف دیکھا کیا۔ لمحہ بھر کے لئے لگا جیسے سارا جسم بے حرکت ہو چلا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی خوف کی ایک لہر سارے وجود میں دوڑ گئی۔ جست لگا کر بستر سے اٹھا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی کی طرف دیکھا، وہ بھی بند تھی لیکن اس کے دوسری طرف کوئی پراسرار شے حرکت کر رہی تھی۔ آہستگی سے کھڑکی کے پاس آیا، چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر کنڈی کھول کر دونوں پٹ وا کر دئے۔

باہر عجیب منظر تھا۔

کچھ دیر تو سمجھ ہی نہ آیا یہ کیا منظر ہے؟ لیکن جب آنکھیں آہستہ آہستہ چیزوں کو گرفت میں لینے لگیں اور حواس قدرے قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ کھڑکی کے آگے ایک طویل صحرا پھیلا ہوا ہے۔ حد نظر تک صحرا ہی صحرا---- مگر اس کا گھر تو شہر کے مرکز میں ہے، پھر یہ صحرا کہاں سے آگیا؟

چند لمحوں کے لئے لگا جیسے نیند میں ہے اور خواب کی حالت میں کسی پراسرار وادی میں پہنچ گیا ہے لیکن آنکھیں ملنے پر بھی صحرا وہیں رہا۔ کھڑکی سے قریب ہو گیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ صحرا کی حدیں دیواروں کو چھو رہی تھیں۔ جلدی سے پلٹا، دروازے تک آیا کہ دیکھے ادھر کیا ہے۔ مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی، بس یہ دیکھ سکا کہ کسی چھوٹی سی درز میں سے بلب کی روشنی کی ایک نحیف کرن فرش تک پہنچ رہی ہے۔

"تو ادھر ابھی شہر باقی ہے" اس نے سوچا' اور دوبارہ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ آسمان صاف تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں پھیلا ہوا صحرا بڑا پراسرار اور غیر معمولی طور پر خاموش لگ رہا تھا۔ وہ مسلسل نظریں جمائے اس کی وسعتوں میں کھویا رہا۔ نظروں کے ٹھہراؤ کے ساتھ ہی دور ایک ننھی سے روشنی ابھری اور پھر آہستہ آہستہ واضح ہوتی دکھائی دی۔ آگے ہو کر اسے دیکھنے کے لئے ذرا سا بڑھا اور پھر جانے کیسے خود بخود اس کے پاؤں فرش سے اوپر اٹھتے گئے اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا صحرا کے عین وسط میں آن گرا۔ گرتے گرتے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی کھڑکی دور پیچھے رہ گئی تھی سامنے ٹمٹماتی ہوئی روشنی تھی لیکن فاصلہ کافی تھا۔ سمجھ نہ آیا کہ پیچھے مڑے یا روشنی کی طرف بڑھے---- چند لمحے تذبذب کا عالم رہا پھر پاؤں آپ ہی آپ روشنی کی طرف بڑھنے لگے' مگر جوں جوں روشنی کی طرف بڑھتا جاتا وہ اور دور ہوتی چلی جاتی۔

آسمان پر پھیلا ستاروں کا جال اور یہ بے کنار صحرا'

اس میں ٹمٹماتی روشنی' جو موجود تو ہے لیکن کتنی دور؟ یہ معلوم نہیں بس رات کے اس پراسرار لمحے میں ایک خاموش صحرا ہے' دور ٹمٹماتی روشنی اور ایک نہ ختم ہونے والا سفر'

چلتے چلتے شائد صدیاں بیت گئیں۔

ساری زندگی بھی تو اسی طرح کا ایک سفر رہی۔ ایک ان دیکھے کی تلاش' کچھ ملا کچھ نہیں ملا اور اب اس صحرا میں بھی وہی نہ ختم ہونے والا سفر' ان دیکھے کی تلاش' مڑ کر دیکھا' کھڑکی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

"واپس کیسے جاؤں گا؟" ایک ان جانا خوف سارے بدن میں رینگ گیا۔

سامنے روشنی ہے تو سہی لیکن پہنچ سے دور--- بہت ہی دور۔

"تو کیا اب زندگی کے صحرا سے نکل کر اس نامعلوم صحرا میں بھٹکنا ہے؟"

چاہا کہ واپس مڑ جائے لیکن اب تو یہ بھی اندازہ نہیں کہ کھڑکی کس سمت ہے۔ چاروں طرف صحرا ہی صحرا ہے' ایک بے کنار دشت اوپر ستاروں بھرا آسمان اور دور ٹمٹماتی روشنی' اور پیچھے--- پیچھے اب کچھ بھی نہیں' بچوں کی شادیاں ہو

چکیں ' وہ اپنے اپنے خوابوں میں مگن ہیں۔ بیوی گھر میں اپنی چودھراہٹ کے نشہ میں سرشار اور وہ ----- اسے سمجھ نہیں آتا کہ اب زندگی کا مقصد کیا رہ گیا ہے۔ سارا دن ایک بے کار شے کی طرح کمرے میں کتابیں پڑھنا یا ناشتے اور کھانے کے وقت چند لمحوں کی رسمی گفتگو ' اب اس کی اہمیت ہی کیا ہے ' بس ایک رسمی سربراہ۔

"شاید یہ روشنی مجھے ایک نیا قالب دے دے" اس نے سوچا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا وہ اور دور ہوتی جاتی۔

چپ ' پھیلا صحرا اور دور کہیں ایک ٹمٹماتی روشنی ' دفعتاً" یوں لگا جیسے کوئی اس کا نام لے لے کر مسلسل آوازیں دے رہا ہے۔ سر جھٹک کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاروں طرف صحرا ہی صحرا تھا۔ ایک بے کنار دشت۔ یہاں تو اس کی اپنی آواز بھی نہیں تو پھر یہ اسے کون پکار رہا ہے۔ اس کا نام لے لے کر آوازیں دے رہا ہے۔

"میرا تو اب کوئی نام نہیں" اس نے خود سے کہا ----- "میں اب یہ صحرا ہی ہوں" اسے سکون سا ملا۔ دشت کے ساتھ دشت اور ریت کے ساتھ ریت ہو کر ذرہ ذرہ ہو جانے میں بھی ایک لذت ہے۔

"کوئی بھی نہیں؟" اس نے شانے اچکائے۔ "میرے نام کی کوئی پکار نہیں" مسلسل دستکیں دینے کے بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو بڑی بہو گھبرا گئی اور چیختی ہوئی بولی ---- "اندر سے کوئی جواب ہی نہیں آتا ----- "اللہ خیر کرے۔"

بڑا بیٹا اور بیوی دوڑتے ہوئے آئے اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے ' لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ صحرا میں کھڑے کھڑے اسے یوں لگا جیسے دور ' بہت دور کہیں کوئی دستک دے رہا ہے اور اسے پکار رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے بیٹوں ' ان کی بیویوں ' دونوں بیٹیوں اور پھر بیوی کے چہرے آنکھوں میں لہرائے لیکن بے نام ہو کر دشت کے ساتھ دشت اور ریت کے ساتھ ریت ہو جانے کی لذت غالب آ گئی۔

"میرا کوئی نام نہیں ' کوئی رشتہ نہیں" اس نے شانے اچکائے اور تیز تیز آگے بڑھنے لگا۔

خواہش

اگر کسی طرح میری زنجیر ڈھیلی پڑ جائے اور میں اسے لے کر بھاگ پڑوں اور دوڑتا ہوا دنیا کے آخری سرے تک پہنچ جاؤں‘ لمحہ بھر کے لئے سنبھلنے کی کوشش کروں اور پھر نیچے جا گروں-----؟ مجھے اس سے غرض نہیں کہ نیچے گر کر میرا کیا ہو گا؟ لیکن اگر کوئی نامہربان ہاتھ مجھے اٹھا کر پھر اپنی جگہ پر لا بٹھائے اور فخر سے کہے کہ میں نے اسے ڈوبنے سے بچا لیا ہے تو میں اسے کیا کہوں گا۔ میں تو اسے یہ بھی نہیں بتا پاؤں گا کہ میں تو عرصہ ہوا ڈوب چکا ہوں اور یہ جسے وہ نکال لایا ہے‘ میں نہیں مجھ سا کوئی اور ہے۔

مجھ سا یہ کوئی اور تو عرصہ سے میرے اندر رہ رہا ہے۔ رہا میں----- تو میں مدتیں ہوئیں ڈوب کر کہیں کھو چکا ہوں‘ ہوا یوں کہ میں اور وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اٹھکیلیاں کرتے چلے جاتے تھے کہ----؟ وہ کون ہے؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

میں اس کے چہرے کی پہچان نہیں رکھتا کیونکہ اس کا چہرہ بدلتا رہتا ہے۔ میں تو بس اس کے لمس اور لمس کی خوشبو سے واقف ہوں اور وہ جہاں بھی ہو جس روپ میں بھی ہو یہ خوشبو مجھے اس کا پتہ بتا دیتی ہے اور میں اسے ہجوم میں سے ڈھونڈھ لیتا ہوں‘ مگر میری اس کی رفاقت کے لمحے بہت ہی محدود اور مختصر ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ رفاقت چند لمحوں کے لئے ہی ہوتی ہے۔

کسی بس میں سفر کرتے ہوئے میں چند لمحوں کے لئے اسے دیکھتا ہوں‘ محسوس کرتا ہوں اور اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس پر قابو پاؤں اور اسے پانے کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کروں وہ کسی سٹاپ پر اتر جاتی ہے۔ میں تذبذب کی اندھی کھائی میں ڈبکیاں ہی کھاتا رہ جاتا ہوں۔ وہ کبھی کبھی مجھے کسی تقریب میں بھی مل

جاتی ہے لیکن وہاں بھی وہی دوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہوں اسے بتاؤں کہ میں کون ہوں تقریب ختم ہو جاتی ہے اور وہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر کسی اور کے ساتھ کہیں کھو جاتی ہے۔ میں اسی طرح کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہوں۔

میری اس کی رفاقت لمحوں ہی کی ہے لیکن کبھی کبھی یہ لمحے پھیل بھی جاتے ہیں، لیکن برسوں پر پھیلے ہوئے یہ لمحے بھی پلک جھپکتے گزر جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں دو سال وہ میرے ساتھ رہی لیکن جدائی کا وقت آیا تو یوں لگا جیسے ہمارا یہ ملنا ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ان دو سالوں میں ہم نے کتنی ہی باتیں کیں، ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھا لیکن میں اسے کبھی یہ نہ بتا سکا کہ اس گفتگو سے آگے بھی ایک تمنا ہے جس کا کوئی نام نہیں۔

باتیں کرتے کرتے وہ کئی بار مجھے یوں تکتی جیسے میرے منہ سے کچھ اور سننا چاہتی ہے میرا جی چاہتا بھی کہ اسے بتاؤں کہ میں اسے کب سے تلاش کر رہا ہوں۔ برسوں پہلے جب ہم بچپن میں ایک دوسرے سے بچھڑے تھے اور اس کے بعد میں نے اسے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اب وہ ملی ہے تو پہچانتی ہی نہیں۔ میں اسے کچھ نہ بتا سکا اور الوداعی تقریب کے بعد ہم الگ الگ ہو گئے۔

رفاقت کے بعد جدائی کا ایک لمبا سفر شروع ہو گیا اس دوران وہ مجھے تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کئی جگہ ملی۔ ملازمت کے دوران میں نے اسے ایک بار اپنے ہی دفتر میں دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے قریب ہوتا اسے اپنی پہچان کراتا میرے ایک ساتھی نے اس سے شادی کر لی اور اسے لے کر کہیں اور چلا گیا۔ ایک بار اور وہ مجھے ایک شادی کی تقریب میں ملی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

میرے لئے تو اس طرح کی باتیں روز کا دکھ ہیں، جنہیں میں سہتا ہوں۔ اسے دیکھتا بھی ہوں، محسوس بھی کرتا ہوں لیکن اسے احساس نہیں دلاتا، احساس دلا کر اسے خواہ مخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی زندگی کی شگفتہ راہوں پر کانٹے بکھیرنے کا کیا فائدہ؟ میرے لئے تو اس کا انتظار ایک نہ ختم ہونے والی اداسی ہے جو کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے حیرت کے چھوٹے سے وقفوں میں بدل جاتی ہے یوں

بھی ہوتا ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے مجھے کسی دوسرے چہرے یا بدن میں دکھائی دے جاتی ہے میں اس کی طرف لپکتا ہوں مگر پھر معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا وہمہ ہی ہے۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ مجھے اس عورت کے روپ میں بھی دکھائی دی تھی جو اب میری بیوی ہے۔ میں نے اسے ایک تقریب میں دیکھا اور اس کی مانوس خوشبو کو محسوس کیا۔ مجھ پر ایک وجد سا طاری ہو گیا اور جب میں نے اپنی ماں کے سامنے اس کا ذکر کیا تو اس نے ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں میں پھر اپنے ارادے سے دست بردار نہ ہو جاؤں۔

ہماری شادی ہو گئی لیکن چند مہینوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ وہ نہیں۔ وہ شاید ایک مختصر سے عرصہ کے لئے اس کے بدن میں آئی تھی؛ یا یوں کہ اس کا کوئی ایک عکس اس میں بھی آ بسا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ میری تلاش اسی طرح جاری ہے۔ لیکن کبھی کبھی یوں ضرور ہوتا ہے کہ اس کا کوئی عکس' خوشبو کا کوئی جھونکا اس عورت میں بھی آموجود ہوتا۔ وہ چند لمحے میری خوشی کے لمحے ہیں لیکن پھر وہی اداسی' نہ ختم ہونے والی اداسی۔ جو زنجیر کی طرح میرے گرد لپٹی ہوئی ہے۔ میں اس زنجیر سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ ٹوٹ نہ سکے تو اسی کو لے کر بھاگ نکلوں اور دوڑتا ہوا دنیا کے آخری سرے تک جا پہنچوں' لمحہ بھر کے لئے مڑ کر اسے دیکھوں اور لڑکھڑا کر نیچے------ خلاؤں میں گرتا چلا جاؤں!

لیکن زنجیر ٹوٹ بھی جائے تو شاید میں دوڑ نہ سکوں کہ میں تو صرف تصور اور خواب ہی میں زندہ ہوں اور یہ جو مجھ سے باہر مجھ سا کوئی ہے---- یہ کوئی اور ہے میں نہیں کہ مجھے تو اپنے پاس ہونا میسر ہی نہیں۔

شوق بندھن کی ناؤ میں

بھور سمے جب جانے کا وقت آیا تو عجب رقت کا سماں تھا۔ وہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں اور ان میں سے جو سب سے بانکی اور سجیلی تھی ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ لئے اس کے پاس آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی' اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن لفظ باہر نہ نکلتے تھے' اس کی سیاہ آنکھوں میں ساون امڈ آیا تھا جس سے کاجل کی لکیر پھیل کر نیچے اتر آئی تھی۔ اس نے خاموشی سے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا' وہ چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی پھر دفعتہ" جھک کر اس نے اس کے پاؤں چھو لئے۔

بہت دیر خاموش رہی' وہ سب کی سب آنکھوں میں ساون لئے اسے دیکھتی رہیں۔ یوں لگا جیسے ایک یگ بیت گیا ہے اور یوں ہی بیٹھے بیٹھے ان کے سروں میں سفیدی ابھر آئی ہے۔

اس نے سر اٹھایا---- "تو اب چلتے ہیں"

کوئی کچھ نہ بولا'

اس نے پھر کہا جیسے اپنے آپ کو سنا رہا ہو--- "تو پھر چلتے ہیں" اب کی بار اس نے جو ان سب میں بانکی اور سجیلی تھی اور جس کی آنکھوں میں امڈے ہوئے ساون نے کاجل کی لکیروں کو پھیلا دیا تھا' ذرا سا آگے آئی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی----- "لوٹ کر کب آئیں گے؟"

وہ بڑی دیر سے اسی سوال کا منتظر تھا لیکن جب سوال ہوا تو وہ جواب نہ دے سکا اور جواب نہ دینے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس بارے میں جانتا نہیں تھا لیکن اسے حوصلہ نہ ہوا' وہ چپ چاپ سامنے دیکھتا رہا۔

"لوٹ کر کب آئیں گے؟" اس کا کاجل پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا اور اب تو

ساون کی نمی اس کی آواز میں بھی در آئی تھی۔

وہ اسی طرح خاموش' بت بنا سامنے دیکھتا رہا' پھر بڑی دیر کے بعد اس کی سوئی ہوئی' کھوئی ہوئی آنکھوں میں زندگی کا شرارہ چمکا' ایک قدم آگے بڑھ کر آہستہ سے بولا---- "جب تم دکھ میں ہو گی اور مجھے یاد کرو گی" آنکھوں میں اڈا ساون کھل کر برس اٹھا' کاجل کی ناؤ موجیں مارتے دریا میں ڈولنے لگی' رک رک کر مگر ٹھہرے ہوئے پر یقین لہجہ میں بولی--- "تو مجھے ور دیجئے کہ میں سدا دکھ میں رہوں اور آپ کو یاد کرتی رہوں۔"

وہ بھیگے پتے کی طرح تیز ہوا میں کانپ کر رہ گیا۔ اتنی شدید آندھی اور ایسی برسات کی تو اسے توقع نہ تھی' اب نہ جواب تھا اور نہ لفظ' اس نے چپ رہنے میں عافیت جانی' لیکن جو کچھ موجود تھا وہ تصور نہ تھا' حقیقت تھی'

وہ سب اس کے گرد اکٹھی تھیں اور ان میں سے جو سب سے بانکی اور سجیلی تھی آنکھوں میں ساون لئے اس کے جواب کی منتظر تھی'

"مجھے دکھ کا ور دیں"

کوشش کے باوجود اس کا ہاتھ ور دینے کے لئے اوپر نہ اٹھ سکا۔ وہ خاموشی سے دو قدم چلا رکا پھر تیز تیز چلتا آگے نکل گیا' وہ سب کی سب اور ان میں سے جو سب سے بانکی اور سجیلی تھی اپنی ساون آنکھوں اور کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کے ساتھ پیچھے--- اور پیچھے' اور پیچھے رہ گئیں!

اور آگے تو رن کا تانبے کی طرح تپا ہوا میدان تھا' جس کا پینڈا ختم ہونے میں نہ آتا تھا' راستے میں کئی سوار' کئی پیادہ آس پاس کی پگڈنڈیوں سے نکل کر اس کے ساتھ اکٹھے ہوتے گئے' کچھ زیادہ جلدی میں تھے آگے نکل گئے' کچھ بہت سست تھے پیچھے رہ گئے' لیکن وہ اپنی چال چلتا آگے بڑھتا رہا' ایک شوق تھا کہ آگے کھینچے چلا جا رہا تھا اور ایک بندھن تھا کہ پیچھے سے آوازیں دیتا تھا' وہ کبھی رکتا' منہ موڑ کر کچھ سننے کی کوشش کرتا' یا لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے اسے دیکھتا' وہ جو سب میں بانکی اور سجیلی تھی اور اس کی بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں' ساون کی اڈتی گھٹاؤں اور برسات میں سب کچھ ڈوب جاتا' چونک کر اس بندھن کی

بندھاہٹ سے باہر نکلتا' آگے سے آتی پر شور آوازیں اور ان کی پکار اپنی طرف کھینچتی اور پینڈا کھوٹا ہو جانے کے خوف سے تیز تیز چلتا کئی سواروں کو پیچھے چھوڑتا چلا جاتا۔

یہ لمبا سفر انہی کھٹی میٹھی یادوں اور برستے ساون کے سپنوں میں آخر ایک دن ختم ہو گیا اور سامنے تابنے کی طرح تپتا میدان آ گیا جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا اور اسے لگا جیسے وہ پلک جھپکنے میں اس رن کے عین بیچوں بیچ کھڑا ہے تلواروں نیزوں اور برچھیوں کے وار روکتا' خود کو بچاتا وہ بھی اس کا ایک حصہ بن گیا۔

"لیکن یہ سب آخر کس لئے؟" دفعتاً" ایک خیال سہمے ہوئے پرندے کی طرح اس کے من کے اجڑے درخت پر لمحہ بھر کے لئے پھدکا۔ ڈھال پر سامنے کی تلوار کا وار روکتے ہوئے اس نے سر جھٹک کر اس ننھے سے پرندے کو اڑانا چاہا لیکن وہ درخت کی شاخوں میں چھپ گیا اور کچھ دیر بعد جب وہ اپنے دشمن کے سینے میں تلوار اتار رہا تھا' ننھا سا پرندہ پھدک کر ٹہنی پر آ بیٹھا۔

"آخر یہ سب کس کے لئے؟"

اس نے سر جھٹک کر پرندے کو اڑانا چاہا لیکن وہ ایک ٹہنی سے اڑ کر دوسری ٹہنی پر جا بیٹھا۔

"دراصل مجھے معلوم ہی نہیں کہ یہ سب کس کے لئے ہے اور کیوں؟" اس نے اپنے من کو تسلی دی' لمحہ بھر کے لئے پرندہ درخت کی شاخوں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن شام ڈھلے جب دونوں طرف کی لاشوں کی گنتی شروع ہوئی تو ننھا سا پرندہ پھر پھدک کر ٹہنی پر آ بیٹھا "آخر یہ------"

"مجھے نہیں معلوم------ مجھے نہیں معلوم" وہ چیخنے لگا "مجھے کچھ معلوم نہیں"

اس کے ساتھیوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا' ایک جلدی سے ٹھنڈا پانی لے آیا---- "لو پیو------- تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں"

اس نے پیالہ ہاتھ میں پکڑ لیا---- لمحہ بھر کے لئے لگا جیسے وہ جو ان سب میں بانکی اور سجیلی تھی دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے اس کے سامنے کھڑی ہے اور پوچھ

رہی ہے---- "لوٹ کر کب آؤ گے؟"

"مجھے نہیں معلوم" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس کے ساتھیوں نے تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھا' "بہتر ہے تم کل خیمے ہی میں رہو' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں' آرام کرو گے تو من قابو میں آجائے گا"

"نہیں میں ٹھیک ہوں----" اسے لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا' لیکن ننھے پرندے کے سوال کا جواب پھر بھی اسے نہ ملا۔

اگلی صبح جب رن شروع ہوا تو اس کے بازوؤں کا تناؤ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ دو تین واروں ہی میں دشمن نے اسے آلیا اور ایک ہی بھرپور وار میں ڈھال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگری۔ بند ہوتی آنکھوں اور اکڑی سانسوں میں اس نے آخری بار اپنے اوپر جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا'

وہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔

تو کیا میں نے خود ہی------' اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آپ کو------

جواب پانے سے پہلے ہی اس کا سانس اکھڑ گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں----- آخری منظر شاید یہی تھا' یا شاید لمحہ بھر کے لئے وہ جوان سب میں بانکی اور سجیلی تھی اپنی ساون آنکھوں اور گھٹاؤں جیسی زلفوں کے ساتھ اس کے پاس آئی تھی اور دودھ کا پیالہ-----

دودھ کا پیالہ لئے وہ اب بھی ندی کنارے بیٹھی اس کی راہ تک رہی ہے' وہ جو ان سب میں بانکی اور سجیلی ہے' اب تو اس کی آنکھوں کا کاجل بھی بہہ بہہ کر اس کے سارے چہرے پر پھیل چکا ہے'

صرف دو فرلانگ پہلے

اب اندازہ نہیں تھا کہ برف کا یہ صحرا کب اور کہاں سے شروع ہوا تھا' شاید اس وقت دن کا کوئی پہر تھا کہ دن سپیدی میں برف کی سپیدی پر قدم رکھا اور شاید دن کی حرارت بھی تھی کہ ٹھنڈک کا احساس نہ ہوا' لیکن اب رات تھی اور سیاہی میں بھی برف سپید ہی تھی البتہ ٹھنڈک نیچے بھی تھی' اور چاروں طرف بھی۔ برف کے سانپ شوک تو رہے تھے مگر ابھی انہوں نے اسے ڈسا نہیں تھا' سردی اس کے سارے بدن پر رینگ رہی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی رگوں میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی' اسے معلوم تھا کہ اگر وہ رک گیا تو سردی اسے ایک دم دبوچ لے گی لیکن پھر بھی وہ لمحہ بھر کے لئے رکا' آسمان کی طرف دیکھا کہ شاید کسی ستارے سے سمت کا اندازہ ہو' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن شناسائی کی ایک بوند بھی پیاسی آنکھوں میں نہ گری۔ اسی ایک لمحے میں ٹھنڈک نے اس کے جسم پر اپنی یخ انگلیوں کی گرفت سخت کر دی۔ اس نے جلدی سے پاؤں ہلانا اور بازوؤں کو گھمانا شروع کیا' لیکن چند لمحوں سے زیادہ یہ مشق نہ کر سکا۔ تھکاوٹ کا ایک غبار سا سارے جسم میں پھیل گیا۔ اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ رک گیا اور تھک کر کہیں بیٹھ گیا تو پھر کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ وقت کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتنی رات بیت گئی ہے اور صبح ہونے میں کتنی دیر ہے۔ صبح ہو گی بھی کہ نہیں--- اس نے مایوسی سے سوچا۔

روانہ ہوتے وقت اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ برف کے اس صحرا میں یوں بے بس ہو جائے گا۔ یا شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ راستے میں برف کا یہ صحرا آ جائے گا۔ اس نے کہاں سے سفر شروع کیا تھا اور کہاں جا رہا تھا؟ اس وقت تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا نہ کوئی یاد تھی' نہ کوئی خیال' نہ کسی آغاز کا تصور اور نہ کسی منظر

کی تمنا' یوں لگ رہا تھا جیسے برف کے ننھے ننھے ذرے اس کے دماغ کے اندر چلے گئے ہیں اور آہستہ آہستہ دماغ کی ننھی ننھی رگوں کو اپنے اندر سمیٹ رہے ہیں۔

وہ کون تھا؟ کوئی تو تھا کہ اس وقت برف کے اس صحرا میں زندگی کی تیزی سے پھسلتی ڈور کو پکڑ رکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں ایک شخص تو ہوں' اس نے سوچا اور نام---- میرا نام شاید برف کے اس صحرا کے اس پار کہیں رہ گیا ہے۔ صحرا کے اس پار کا خیال آتے ہی دھندلی سی ایک بستی دھیرے سے اس کے تصور میں اتری' انہی دھند لکوں میں لپٹا ایک چھوٹا سا گھر' جس کے ایک کمرے میں آگ کے گرد بیٹھے کچھ لوگ---- آگ کی تھپک نے لمحہ بھر کے لئے اس کے جسم کے کسی حصے کو ٹکورا' لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھنڈک ایک تیز سوئی کی طرح اس کے سارے وجود میں پھر گئی۔ اس نے تیزی سے دونوں پاؤں کو ہلایا اور ہلکے ہلکے اچھلنا شروع کیا' مگر چند لمحوں میں زیادہ یہ مشق جاری نہ رہ سکی اور تھکاوٹ کی ایک گہری لہر اس کے سارے وجود پر چھا گئی' ایک گہرا خوف آہستہ آہستہ اس کے چاروں طرف پھیل گیا اور رفتہ رفتہ اپنا حصار تنگ کرنے لگا۔ اس نے ٹھنڈک سے آٹھرے ہوئے پپوٹوں کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی' چاروں طرف یخ اندھیرا' اوپر کھلا آسمان اور نیچے برف---- برف ہی برف۔

اسے معلوم تھا کہ موت نیند کی صورت اس کے وجود پر اتر رہی ہے' لیکن اسے روکنا اس کے بس میں نہیں تھا' پھر بھی اس نے ٹھنڈک سے آٹھرے ہوئے پپوٹوں کو کھولنے کی کوشش کی' اس نیند میں ایک خمار تھا اور اس خمار میں دھند میں لپٹے گھر کا وہ کمرہ جہاں آگ کے گرد تھے لوگ---- اس نے پپوٹوں کو پھیلاتے ہوئے انہیں پہچاننے کی کوشش کی' لیکن کوئی شکل واضع نہ ہوئی' بس آگ کے گرد تھے سائے سے' ہونٹ ہلتے ہوئے لیکن لفظ سنائی نہ دیئے۔

سردی کی یخ انگلیوں نے اس کے وجود پر اپنی گرفت اور سخت کر دی اور دھیرے دھیرے اس کے اندر اترنے لگیں' اس نے پاؤں پر اچھلنے کی ایک کوشش کی لیکن سردی کے وزن سے بندھے پاؤں اپنی جگہ سے نہ ہلے' سردی بھاری وزن کی صورت اس کے بازوؤں سے بھی لٹک گئی تھی۔ سردی کے وزن سے بوجھل

قدم اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا---- شاید چند ہی قدم اور---- دفعتاً ٹھنڈ بھاری یخ ہاتھ کی طرح اس کی کمر پر لگی اور وہ منہ کے بل آگے جا گرا۔

شاید یہی آخر ہے---- برف کے ننھے ننھے ذروں نے اس کے دماغ کی ساری رگوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ سوچ کی بجائے دماغ میں ایک ٹھنڈی یخ لہر اٹھی۔ لفظوں کے بعد اب خیال اور تصور بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اپنے سارے وجود کو سمیٹتے ہوئے اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ آدھا اٹھا لیکن سردی اور تھکن کے بوجھ نے اسے پھر گرا دیا۔ چاروں طرف یخ بستہ اندھیرا' اوپر کھلا آسمان اور نیچے برف ہی برف' اس نے بند ہوتی آنکھوں کو پوری قوت جمع کر کے' کھولنے کی کوشش کی' دیکھنے کی کوشش کی' لیکن آنکھیں ایک تہائی سے زیادہ نہ کھلیں اور خود بخود آہستگی سے بند ہو گئیں۔ ایک ٹھنڈی برفیلی چٹان اس کے اندر تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اس نے بکھرتی توانائی کو بوند بوند اکٹھا کر کے پھر کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی' مگر چوتھائی بھی نہ اٹھ سکا اور اگلے ہی لمحے پھر برف پر جا گرا۔ برف کے ننھے ذرے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو اس نے ایک بار پھر ساری توانائی اکٹھی کر کے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی' لیکن یوں لگا جیسے کسی نے پپوٹوں کے ساتھ منوں ٹھنڈک باندھ دی ہے۔ اس نے لیٹے لیٹے پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن پاؤں تو اس کے ساتھ ہی نہیں تھے نچلا دھڑ تو موجود ہی نہیں تھا' شاید اوپر والا دھڑ بھی موجود نہیں تھا' صرف ذہن میں ایک سرسراہٹ سی تھی۔ ایک تصور سدا انتظار کرتا ایک ننھا سا وجود' لمحہ بھر کے لئے گرماہٹ کے ایک مشفق نرم ننھے ہاتھ نے اس کی منجمد ہوتی آنکھوں کو چھوا۔ ایک رنگ برنگا پرندہ اس کے دل کے آنگن میں پر پھیلا کر لمحہ بھر کے لئے ناچا' چہکا اور یخ سردی میں کہیں کھو گیا۔

اس نے اپنے سارے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی اور اپنی امیدوں' جینے کی امنگوں اور توانائیوں کو بوند بوند اکٹھا کر کے آنکھیں کھولنے اور کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ آنکھوں نے کوئی حرکت کی نہ وہ اپنی جگہ سے ہل سکا۔ ٹھنڈک نے اس کے سارے وجود کو ڈس لیا اور اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی اس

کے دماغ میں آ گئی۔ اس نے تصور کیا کہ وہ اٹھنے' آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ تصور ادھورا ہی رہ گیا۔ اس کے ہونٹ لمحہ بھر کے لئے ذرا سا ہلے اور پھر برف کی قاش بن گئے۔ آخری خیال بس' انتظار کرتے ایک ننھے سے وجود کا گرم احساس' اور یہاں سے صرف دو فرلانگ دور' ہوسٹل کے کمرے میں آگ کے گرد بیٹھی اس کی بیٹی سوچ رہی تھی۔۔۔۔ ابو ابھی تک نہیں پہنچے' ماں نے تو فون پر یہی بتایا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی روانہ ہو گئے تھے۔

لیکن اسے کیا معلوم کہ موٹر تو راستے میں خراب ہو گئی تھی اور بیٹی تک پہنچنے کی جلدی میں وہ پیدل ہی کچے راستے سے ہو نکلا تھا۔۔۔۔!

متلاہٹ

عام طور پر متلی کا تعلق ہاضمے کے نظام سے ہے لیکن یہ عجیب مریض تھا کہ جیسے ہی اس کے کمرے میں کچھ لوگ اکٹھے ہوتے اس کی طبیعت خراب ہونے لگتی اور اس پر متلاہٹ کا ایسا شدید دورہ پڑتا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مختلف دوائیں آزمانے کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا' اکیلا ہوتا تو گھنٹوں ٹھیک رہتا لیکن جیسے ہی اس کے ملنے والے یا ہسپتال کے دو چار اس کے کمرے میں داخل ہوتے اسے شدید متلاہٹ شروع ہو جاتی۔

فزیشن ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے مریضوں کے نفسیاتی معاملات سے بھی خاصی دلچسپی ہوتی ہے لیکن یہ مریض میری سمجھ سے باہر تھا۔ اچھی سے اچھی دوائیں اور گھنٹوں اس کے ساتھ گفتگو کے بعد میں اس کی بیماری کی نوعیت نہ سمجھ سکا' اس سے مجھے خود الجھن ہونے لگی' فرصت ملتے ہی میں اس کی فائل کھول لیتا' لیکن اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کسی ادارے میں معقول جگہ کام کر رہا تھا' ٹھیک ٹھاک آمدنی تھی' یہ بیماری بھی اچانک ہی شروع ہوئی تھی۔ وجہ نہ اسے معلوم تھی نہ اس کی بیوی کو۔

اس وقت بھی میں اس کی فائل دیکھ رہا تھا کہ نرس کچھ لینے کمرے میں آئی۔ فائل کھلی دیکھ کر کر اسے کچھ یاد آیا کہنے لگی "آپ نے کہا تھا نا کہ اس کی بیوی سے پوچھوں؟"

"ہاں ہاں" میں نے دلچسپی سے کہا------ "کیا بتایا اس نے" "شاید آپ کے لئے اہم ہو" وہ قدرے توقف سے بولی "اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ یہ بیماری شروع ہونے سے چند دن پہلے وہ کسی جھگڑے میں ایک رات تھانے میں رہا تھا" "اچھا" میں چونکا--- "اس وقت اس کے کمرے میں کون ہے؟"

"کوئی نہیں"

میں نے جلدی سے فائل بند کی اور سٹیتھوسکوپ اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا مجھے اندر آتے دیکھ کر اس نے اخبار ایک طرف رکھدیا اور ذرا اوپر ہو کر چارپائی کے سرہانے سے ٹیک لگادی۔

میں نے پوچھا----- "کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک" اس نے خوش خلقی سے کہا

میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔

"آج کل تو اخباروں میں لڑائی جھگڑوں کی خبروں کے سوا کچھ نہیں۔"

اس نے سرہلادیا۔

"اب تو راہ چلتے جھگڑتے ہو جاتے ہیں' لگا ہے لوگوں کے مزاجوں میں کچھ تلخی آگئی ہے۔"

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اس کی وجہ شاید ہمارے مجموعی معاملات میں ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "شاید پورے ماحول میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔"

وہ اسی طرح خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اچانک سوال کیا۔ "پچھلے دنوں آپ کا بھی تو کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔"

اسے اس طرح جھٹکا لگا جیسے بجلی کے ننگے تار پر ہاتھ آگیا ہو۔ آنکھیں جھک گئیں۔ گہری چپ نے کمرے کو اپنی بغل میں لپیٹ لیا۔

پھر بہت ہی دھیمی آواز میں جسے میں بمشکل سن سکا بولا---- "ہاں"

قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں"------ وہ آہستہ سے بولا---- " روڈ بلاک تھی گاڑیاں بے ترتیبی سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے بچوں کو لینے کی جلدی تھی۔ میں نے بھی ایک سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی اور آگے

گھڑی جیپ سے کترا کر آگے آگیا۔ اس پر جیپ والا نیچے اترا یا اور کہنے لگا میں نے اس سے آگے گاڑی نکالنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ میں نے کہا۔ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے۔ روڈ بلاک ہے اور سبھی یونہی کر رہے ہیں اس پر وہ مشتعل ہوگیا اور بولا تمہیں معلوم نہیں میں یہاں کا اے سی ہوں' تمہیں جرات کیسے ہوئی ہے مجھ سے آگے نکلنے کی' اس پر تکرار ہو گئی۔ تو تو میں میں سے بات گالی گلوچ تک آگئی۔ ٹریفک آدھے گھنٹے سے بند تھی۔ بچوں کی چھٹی ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں اتنا زچ ہوا ہوا تھا کہ میں نے بھی اسے خوب سنائیں۔ اتنے میں ٹریفک والے آگئے اس نے ان سے کچھ کہا' چنانچہ انہوں نے مجھے تھانے جانے پر مجبور کیا بلکہ زبردستی تھانے لے گئے۔"

وہ چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا" میں نے تجسس سے پوچھا۔

وہ چپ خلاء میں دیکھتا رہا۔ بہت دیر چپ رہا پھر دھیمی آواز میں بولا ---- "تھانے میں انہوں نے مجھے بنچ پر بٹھا دیا۔ ایک ایک آتا' گھور کر دیکھتا اور دو چار گالیاں نکال کر کہتا ------ اچھا تو یہ ہے۔

میں نے کئی دفعہ کہا ---- دیکھو میں سرکاری افسر ہوں مجھے اپنے بچوں کو سکول سے لینا ہے۔

اس پر تھانے دار نے کہا ----- "تمہاری ماں کی ----- خاموش بیٹھو"

میں نے کہا ---- مجھے کس جرم میں یہاں لائے ہو مجھے گھر فون کرنے دو۔"

اس پر تھانیدار مشتعل ہوگیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔

"اچھا تو تم اپنا جرم معلوم کرنا چاہتے ہو۔"

"ہاں" میں نے غصے سے کہا --- "میں سرکاری افسر ہوں"

"اچھا تو تم سرکاری افسر ہو" وہ پھنکارتے ہوئے بولا" الو کے پٹھے مجھے قانون پڑھاتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر مارا مجھے لگا میرے ہونٹوں سے کوئی نمکین سی شے بہہ رہی ہے۔

"اگر اب بولے تو مار مار کر الو بنا دوں گا۔"

اس نے میرے کندھے کو دبا کر مجھے بنچ کی گود میں دھکیل دیا۔ شام ہو گئی۔ ہر آنے والے کی گالیاں سن سن کر میرا دماغ سن ہو گیا۔ کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس لمحہ بھر کے لئے سڑک پر انتظار کرتے بچوں کی تصویر ذہن میں ابھرتی اور ڈوب جاتی۔ دور کہیں سے بیوی کی آواز آتی ---- "ابھی تک کیوں نہیں آئے۔"

پھر ایک گھپ خاموشی اور نیم تاریکی

ایک نیم تاریک خاموشی کا تالاب، جس میں میں لمحہ لمحہ ڈوب رہا تھا۔

میں کون ہوں ----- کہاں ہوں ------ یہ کیا ہو رہا ہے

کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

خاموشی کا ایک نیم تاریک تالاب، لمحہ بہ لمحہ مجھے اپنے اندر کھینچے جا رہا تھا اور وقت ----- وقت شاید تھم گیا تھا یا اتنا تیز رفتار ہو گیا تھا کہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

یہ اذیت تھی ---- یا شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا کوئی وجود نہیں تھا ---- کوئی احساس، کوئی تشخص ---- کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

میں کون تھا ----- کوئی بھی نہیں تھا۔

بس سانس لیتا ایک لوتھڑا ------

شاید ایک صدی بیت گئی تھی۔

اندھیرا، اندھیرا ----- چاروں طرف اندھیرا، چھت سے لٹکا ایک بلب جس سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تھانیدار کی کرسی خالی تھی، سب جا چکے تھے۔ بنچ پر ایک میں تھا اور دروازے میں کھڑا سپاہی، جس کی نظریں بھوکے گدھ کی طرح مجھ پر جمی ہوئی تھیں، جمی رہیں ------ جمی رہیں، پھر وہ آہستہ سے میرے قریب آیا اور دھیمی آواز میں بولا ------ "کسی کو اطلاع بھیجنی ہے یا یہیں رہنا

ہے۔

میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو پھر جیب میں ہاتھ ڈالونا۔"

میں نے میکنکی انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے جھپٹ کر بٹوہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا------ "اتہ پتہ بتاؤ"

مجھے معلوم نہیں میں نے اسے کیا بتایا

اس نے سرہلایا------ "فکر نہ کرو صبح ہوتے ہی خبر ہو جائے گی۔

وہ چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیامعلوم" اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے ایسے کہا جیسے اس کا مخاطب میں نہیں کوئی اور ہے------ "میں تو اسی رات مرگیا تھا۔" تھانے ہی میں اسی بنچ پر بیٹھے بیٹھے، حرکت قلب بند ہو جانے سے۔

خاموشی گہری ہو گئی۔

وہ چپ خلاء میں کسی نامعلوم شے کو گھورے جارہا تھا------ گھورے ہی جارہا تھا۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہاں تو آدھے سے زیادہ شہر اسی طرح بنچوں پر بیٹھے بیٹھے مرچکا ہے اور.......

دفعتاً اس کے تنفس میں تیزی آگئی۔ میں اس کی طرف بڑھا، لیکن لگا میرے اپنے اندر بھی کوئی چیز تیزی سے پھیل رہی ہے۔ میں نے جلدی سے نرس کو بلانے والا بٹن دبا دیا۔ جتنی دیر میں نرس نے کمرے کا دروازہ کھولا، ابکائی میرے منہ تک آچکی تھی۔ وہ حیرت سے دروازے میں کھڑی، ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"مارزین کے دو انجکشن جلدی" میں نے بمشکل کہا لیکن نرس دیر تک نہ لوٹی۔ متلاہٹ کے بھنور میں غوطے کھاتے ہوئے میں نے سوچا------ "شاید وہ بھی------ شاید سارا شہر ہی------!"

رشید امجد سے گفتگو

محرک گفتگو، قرۃ العین طاہرہ

☆ لکھنے کی ابتداء کیونکر ہوئی۔ ابتداء میں کن مصنفین سے متاثر ہوئے۔ ادبی ذوق کے نکھار میں کن لوگوں کا حصہ رہا؟

☆☆ یہ ۱۹۶۰ء کے آغاز کی بات ہے۔ میں ۵۰۱ ورکشاپ میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن میرے مطالعے کا موضوع زیادہ تر جاسوسی ناول اور ان کے تراجم تھا۔ دفتر میں حاضری کے فارم مکمل کرنے کے بعد میں فارغ ہو جاتا تھا چنانچہ ایک آدھ کتاب ساتھ لے جاتا تھا اور پڑھتا رہتا تھا۔ اسی سیکشن میں ایک اور نوجوان بھی اسی طرح کتاب پڑھتے دکھائی دیتا تھا اس کا نام اعجاز حسین تھا۔ ہم نے کتابوں کا تبادلہ شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اعجاز راہی کے نام سے لکھتا ہے۔ ایک روز اس نے مجھے اپنی ایک کہانی پڑھنے کو دی۔ کہانی پڑھ کر میں نے اسے کہا کہ ایسی کہانی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ اس نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔ سو دو ایک دنوں بعد میں نے اسے ایک کہانی لکھ کر دکھائی۔ اس نے کہا یہ تو افسانہ ہے اور تم اب باقاعدگی سے لکھا کرو۔ چنانچہ میں نے لکھنا شروع کر دیا اور اختر رشید ناز کے نام سے اس زمانے کے رومانی پرچوں (رومان وغیرہ) میں یہ کہانیاں بھیجنا شروع کر دیں۔ دو تین کہانیاں آگے پیچھے چھپ گئیں۔ مجھے لکھنے کی چاٹ لگ گئی۔ اسی دوران اعجاز راہی ایک شام تین چار دوستوں کو لے کر میرے گھر آن پہنچا اور بتایا کہ یہ سارے راولپنڈی کے نوجوان ادیب ہیں۔ ان میں نثار ناسک اور سلیم الظفر شامل تھے۔ میرے پاس انہیں چائے پلانے کے پیسے نہیں تھے نہ گھر میں کوئی ڈھنگ کی جگہ بیٹھنے کے لئے تھی چنانچہ ہم کشمیری بازار میں واقع پارک میں چلے گئے۔ نثار ناسک ہم میں بڑا تھا۔ اس نے نوجوان ادیبوں کے مسائل پر بڑی

مبسوط گفتگو کی اور تجویز دی کہ ہمیں ہر شام کہیں اکٹھا ہونا چاہئے اور ایک ادبی انجمن بھی بنانا چاہئے۔ چنانچہ بڑی بحث کے بعد "بزم میر" کے نام سے ایک انجمن کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ مجھے اس کی مجلس عاملہ کا رکن بنایا گیا۔ دوسرے دن شام سے ہم نے پنڈی ہوٹل (راجہ بازار) میں اکٹھا ہونا شروع کر دیا۔ یہیں میری ملاقات غلام رسول طارق سے ہوئی۔ "بزم میر" کے ہفتہ وار اجلاس بھی شروع ہو گئے۔ یہ اجلاس موچی بازار کے ایک ہوٹل میں ہوتے تھے۔ دوسرے تیسرے جلسے میں میں نے ایک کہانی پڑھی۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو غلام رسول طارق نے مجھے روک لیا اور کہنے لگے۔ یہ کہانی تم نے خود لکھی ہے۔ میں نے کہا' جی میں نے ہی لکھی ہے۔ کہنے لگے' کل دوپہر کو مجھے صدر بوہڑ ہوٹل میں ملنا میں صدر میں ایک پریس میں کام کرتا ہوں اور دوپہر کا کھانا اس ہوٹل میں کھاتا ہوں۔ میں دوسرے دن وہاں پہنچ گیا۔ طارق صاحب بڑی شفقت سے ملے اور کہنے لگے۔ دیکھ بچے تم میں کہانی لکھنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ لیکن ایک تو فضول لوگوں سے بچو اور دوسرے کوئی ڈھنگ کا نام رکھو۔ یہ اختر رشید ناز اچھا نام نہیں۔ میں نے کہا تو آپ ہی کوئی نام رکھ دیں۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد طے پایا کہ اب میں رشید امجد ہوں۔ انہوں نے میری گزشتہ دن پڑھی کہانی میں ایک دو زبان کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ اسے کسی اچھے پرچے میں بھیجو۔ میں نے یہ کہانی میرزا ادیب صاحب کو بھیج دی جو "ادب لطیف" کے مدیر تھے۔ ایک ہفتہ میں ہی میرزا صاحب کا خط آیا جس میں کہانی کی بڑی تعریف کی گئی تھی اور یہ مژدہ تھا کہ کہانی زیر ترتیب شمارے میں آ رہی ہے۔ سو رشید امجد کی پہلی کہانی "لیمپ پوسٹ" کے نام سے ادب لطیف کے ستمبر ۶۰ء کے شمارے میں چھپی۔ یہ کہانی اس وقت کچھ نیم استعاراتی سی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ کہانی ادب لطیف میں چھپ جائے گی' چنانچہ میں نے اس کے آخر میں لکھا تھا (ایک چینی کہانی سے ماخوذ)۔ اس کے بعد میں نے کئی کہانیاں لکھیں جو سادہ بیانیہ میں تھیں۔ ۱۹۶۵ء میں' میں نے اسی کہانی کو دوبارہ لکھا اور یہی کہانی "لیمپ پوسٹ" ایک نئے علامتی انداز سے اوراق کے چوتھے شمارے (اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں چھپی۔ یہ میرے نئے دور کا آغاز تھا۔ ستمبر ۶۰ء میں اختر رشید ناز سے رشید امجد

برآمد ہوا تھا اور اکتوبر ۱۹۶۶ء میں اس رشید امجد میں سے ایک نئے رشید امجد نے جنم لیا جس نے علامت کو اپنا پیرائیہ اظہار بنایا۔ اس دوران جن لوگوں کو میں نے پڑھا ان میں منٹو اور بیدی دور تک میرے ساتھ چلے۔ میری ابتدائی کہانیوں پر منٹو کے خاصے اثرات ہیں، خصوصاً" موضوع کے حوالے سے، جنس ایک عمر میں سب سے پسندیدہ موضوع ہوتا ہے۔ میری ابتدائی کہانیوں کا محور بھی جنس ہے۔ ان میں منٹو جیسی نفسیاتی دبازت تو نہیں، لیکن میں نے جنس کو معاشی بدحالی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ "بزم میر" کے بعد "حلقہ ذہن جدید" وجود میں آیا۔ اس کا سیکرٹری میں تھا۔ اس کے بعد "لکھنے والوں کی انجمن" وجود میں ائی۔ اب پنڈی میں نئے لکھنے والوں کا ایک مضبوط گروپ بن گیا تھا۔ نئ لسانی تشکیلات کی بحثیں زور و شور سے جاری تھیں۔ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس بھی شروع ہو چکے تھے لیکن سینئر لکھنے والے ہمیں گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ اختر احسن اور مصطفیٰ کمال نے "پنڈی کلچرل فورم" کے نام سے ادبی انجمن بنائی تھی لیکن نئے پن کے تمام تر دعوؤں کے باوجود یہ لوگ بھی ایک اسٹیٹس سے نیچے نہیں اترتے تھے چنانچہ راولپنڈی اسلام آباد کے تمام نئے لکھنے والے منشا یاد، اعجاز راہی، سرور کامران، مظہرالاسلام، نثار ناسک، سلیم الدین سلیم، سلیم الظفر، بشیر مرفی مرحوم لکھنے والوں کی انجمن میں اکٹھے ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے کچھ سینئر آفتاب اقبال شمیم، ماجد الباقری بھی انجمن کے جلسوں میں آنے لگے اس وقت "؟اوراق" اور "شب خون" نئے ادب کے ترجمان تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد پنڈی آتے اور انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ اب ہم لوگوں نے حلقہ میں بھی جانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ حلقہ کے جلسوں میں نئے ادب کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ میرے ادبی ذوق کے نکھار میں حلقہ ارباب ذوق، لکھنے والوں کی انجمن اور شخصیات میں سے استاد غلام رسول طارق کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا اور اوراق کا بہت بڑا حصہ ہے۔ خصوصاً" جدید فکری رجحانات اور رویوں کو نمایاں کرنے اور مجھے بطور ایک علامت نگار متعارف کروانے میں وزیر آغا اور اوراق کے نام میرے لئے ہمیشہ محترم رہیں گے۔

☆ آپ کے علامتی افسانوں میں تمثیلی انداز نمایاں ہے۔ تمثیل ہماری اساطیری داستانوں میں بھی موجود ہے۔ یوں ایک طرف تو آپ کا شمار جدید علامتی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف آپ کا رشتہ قدیم داستانوں سے جا ملتا ہے۔ یہ کوشش شعوری ہے یا بات خود بخود بن جاتی ہے؟

☆☆ میرے افسانوں میں علامت' تجرید اور استعارے کے ساتھ ساتھ تمثیل بھی موجود ہے۔ تمثیلی انداز ہمارے ادب میں نیا نہیں۔ ہماری داستانوں میں ان سے بہت عمدگی سے کام لیا گیا ہے' اس حوالے سے تمثیل ہماری داستانی روایت کا ایک حصہ ہے' اور اس طرح میرا ایک رشتہ داستانوں سے بھی قائم ہوتا ہے۔ پہلی بار مجھے اس کا احساس قاضی عبدالستار نے کرایا تھا۔ وہ ایک وفد کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ میری ان سے دو تین ملاقاتیں اکادمی کے جلسوں میں ہوئیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کے اسلوب کا مطالعہ رجب علی بیگ سرور کو ذہن میں رکھ کر ہونا چاہئے۔ اس وقت تو میں نے اس پر غور نہیں کیا لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ میرا ایک گہرا تعلق اساطیر سے ہے' لیکن میرا انداز اور اسلوب اساطیری یا داستانی نہیں بلکہ میں نے اسے ایک جدید صورت میں استعمال کیا ہے جو اپنے عہد کی مروج زبان' محاورے اور انداز و مزاج کے دائرے میں اپنی ایک الگ شناخت بناتا ہے۔ یہ کوشش اگر شعوری ہو بھی تو اس کے پیچھے ایک لاشعوری رویہ ضرور موجود ہے جو میرے اسلوب کو روایت سے بھی جوڑتا ہے اور اسے نیا پن بھی عطا کرتا ہے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ (چند ایک سے قطع نظر) سب سے زیادہ نقصان' ان افسانہ نگاروں نے جدید افسانے کو پہنچایا ہے جنہوں نے افسانہ نگاری کو شاعری سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے افسانوں میں بھی شعری فضا پائی جاتی ہے۔ آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

☆☆ مجھے آپ سے اتفاق نہیں کہ شعری فضا نے افسانے کو نقصان پہنچایا ہے۔ بات یوں ہے کہ علامت' استعارہ اور تشبیہ شعری وسائل ہیں۔ جدید افسانہ نگار نے ان شعری وسائل کو استعمال کر کے اپنی کہانی میں معنوی دبازت پیدا کی ہے اور اسے ہمہ جہت بنایا ہے۔ ان شعری وسائل کا استعمال انور سجاد کے یہاں بھی ہوا ہے

لیکن انور سجاد کے یہاں شعری فضا پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ان کے اسلوب کی خشکی اور حسابی ترتیب اس میں مزاحم ہے۔ یہ شعری وسائل ہر جدید افسانہ نگار کے یہاں موجود ہیں لیکن میرے یہاں ان کے استعمال کے طریقہ کار نے ایک ملائمت اور معنوی دبازت پیدا کی ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ افسانے کو نظم سے قریب کرنا دیگر رویہ ہے اور شعری وسائل کا استعمال دوسرا رویہ ہے۔ میرے افسانوں میں یہ فضا اور وسائل Readability پیدا کرتے ہیں اور میرے اسلوب میں ایک ایسی روانی پیدا کرتے ہیں کہ کہیں معنوی ترسیل نہ بھی ہو رہی ہو تو بھی قرات میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ بعض افسانے (خاص طور پر ساٹھ کی دہائی میں) تو بنیادی طور پر پڑھے ہی نہیں جاتے۔ ان کی زبان و اسلوب میں ایسی لکنت ہے کہ قاری کو بار بار جھٹکا لگتا ہے۔ میرے اسلوب میں یہ بات نہیں۔ میں نے شعری وسائل کو معنوی دبازت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے اور انہیں تخلیقی سطح پر اپنے اسلوب کا حصہ بنایا ہے، اس لئے ان کے استعمال میں شعوری کوشش شامل نہیں بلکہ یہ میرے مجموعی تخلیقی عمل کا ایک حصہ ہیں۔ پھر یہ کہ میرے تہہ دار شعور اور انکشافات ذات کے گہرے مطالعے اور بیان کے لئے ان کا استعمال ضروری تھا۔

☆ بے نام کردار اور بے چہرہ آدمی' آپ کی کہانیوں میں نمایاں ہیں۔ یہ بے نام کردار اور بے چہرہ انسان معاشرے کی بے معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا ان بے نام کرداروں اور بے چہرہ انسانوں کے ہجوم میں آپ خود اپنے تشخص اور اپنی پہچان کے متلاشی ہیں؟

☆☆ سایہ دراصل جسم ہی کا ایک علامتی اظہار ہے۔ بے نام کردار اور بے چہرہ آدمی بھی اسی ہجوم کا ایک حصہ ہیں جو خود بے شناخت ہوا جا رہا ہے۔ ہمارا عہد ایک بڑے زوال کے تسلسل میں ہے اور زوال میں چیزیں بے چہرہ اور بے شناخت ہو ہی جاتی ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کا افسانہ (The Other) دوسری ذات کی تلاش کا افسانہ ہے۔ یہ زمانہ دروں بینی کا ہے جب افسانہ نگار باہر سے اندر کی طرف جا رہا تھا۔ خارج سے باطن کی طرف اس سفر کے پس منظر میں سیاسی زوال' سماجی زوال' مارشل لاء اور بہت سے دوسرے عوامل شامل ہیں۔ اندر کی شخصیت بے نام اور

بے چہرہ ہے اس سارے حوالے سے میرے افسانوں میں شناخت اور تشخص ایک اہم موضوع ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ایک ارتقاء ہوا ہے۔ میرے پہلے مجموعے "بے زار آدم کے بیٹے" میں جنسی اور معاشی فرسٹیشن کا شکار ایک ایسا اینگری ینگ مین ہے جو جنس اور معاش کی کشمکش میں اپنا تشخص ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کی بے شناختی بہت انفرادی اور ہیجان خیز جذباتیت سے وابستہ ہے۔ لیکن آگے جا کے شناخت کا یہ مسئلہ طبقاتی کشمکش سے جڑ جاتا ہے۔ تیسرے مجموعے "سہ پہر کی خزاں" میں میرے کردار سیاسی جبر میں اپنا چہرہ تلاش کر رہے ہیں۔ "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" میں شناخت کا یہ مسئلہ کائناتی ہو جاتا ہے جہاں ازل سے ابد تک کے سفر میں شناخت کا معاملہ روحانی ہو جاتا ہے اور اس میں مابعد الطبیعاتی رنگ آ جاتا ہے۔ شناخت کے ان مرحلوں میں میرے اسلوب میں بھی ایک تبدیلی آئی ہے اور شناخت کی ان پرتوں کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شناخت کی صورتیں بدلی ہیں میرے اسلوب و اظہار میں بھی جذباتیت اور غصہ کم ہوتا گیا ہے اور کشفی دبازت اور پہلوداری بڑھتی گئی ہے۔

☆ آپ کے افسانوں میں تشبیہی انداز کی بجائے استعاراتی فضا نمایاں ہے۔ بعض علامتوں یا بیشتر علامتوں سے آپ کے قاری واقف نہیں ہوتے اور یہ عمل ان کے لئے الجھن کا باعث ہے۔ آپ قاری کا امتحان کیوں لینا چاہتے ہیں؟ آپ کے بعض افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ افسانہ لکھتے ہوئے آپ کے پیش نظر یہ رائے ہوتی ہے کہ کہانی ایک حل طلب معمہ ہے اور اگر یہ معمہ نہ ہو تو قاری کے لئے اس میں کشش پیدا ہونا ناممکن نہیں۔

☆☆ میرے افسانوں میں صرف علامت کا استعمال نہیں بلکہ میں نے پیکر تراشی' استعارہ اور کہیں تمثیل سے بھی کام لیا ہے۔ بعض افسانے Absurd بھی ہیں۔ تجرید بھی ہے۔ علامت کا تعلق اسلوب سے ہے اور تجرید کا خیال سے۔ میں نے بعض جگہ ان سارے وسائل کو اکٹھا بھی کیا ہے۔ اچھی علامت تو اپنے ماحول سے پیدا ہوتی ہے' یہی صورت دوسرے وسائل کی بھی ہے۔ لیکن بہرحال علامت استعارہ یا اشارہ نہیں ہوتی اس کی معنوی تہہ تک پہنچنے کے لئے ذہانت کی ضرورت

ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں ذہین قاری کی اصطلاح بہت عام تھی' میں اس پر اصرار تو نہیں کرتا لیکن یہ بات بہرحال اپنی جگہ ہے کہ لکھا ہوا لفظ سب کے لئے نہیں ہوتا اور وہ لفظ جو کسی فن کے ساتھ جڑ جاتا ہے اس کا ترسیلی دائرہ اور بھی محدود ہو جاتا ہے۔ میرے چند افسانوں کو چھوڑ کر جو ساٹھ کی دہائی سے تعلق رکھتے ہیں' ترسیل یا ابلاغ کا مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ میرا اسلوب اتنا رواں ہے کہ افسانہ خود کو پڑھواتا چلا جاتا ہے۔ نئے افسانے میں مجموعی طور پر ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بات چند افسانوں کی وجہ سے ہوئی اور بہت سے نقادوں نے جدید افسانے کو پڑھے بغیر اس کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ ترسیل یا ابلاغ کے ضمن میں مجھے میرا جی کا یہ جملہ دہرانا ہے کہ "ابلاغ ایک اضافی قدر ہے" ایک وقت میں کسی فن پارے کا عدم ابلاغ دوسرے وقت میں ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کی خوبی بن جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ابلاغ کی اپنی سطحیں ہیں جو قاری کی ذہنی سطحوں کے مطابق اپنے معنی وا کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نیا افسانہ بہرحال پرانے افسانے سے مختلف ہے نہ صرف ہیئت و بنت کاری کے حوالے سے بلکہ زبان و بیان کے حوالے سے بھی' اس لئے وہ قاری جس کے پڑھنے کی ٹریننگ پرانے افسانے کے حوالے سے ہوتی ہے' ابتداء میں نئے افسانے کو سمجھنے میں وقت محسوس کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نیا افسانہ اپنا دائرہ وسیع کرتا گیا۔ تیسرے یہ کہ ابتداء میں خود نئے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی عجز بیاں کی وجہ سے کئی ابلاغی مسائل پیدا ہوئے جو آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ اس لئے اب نئے افسانے یا میرے افسانے کے بارے میں عدم ابلاغ کی بات کوئی معنی نہیں رکھتی۔

☆ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کہانی کار اپنی کہانی کی ابتداء اس کے انجام سے کرتا ہے۔ اس تکنیک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ کہانی کی ابتدا چونکا دینے والی ہو یا نہ ہو لیکن دلچسپ ضرور ہو تاکہ قاری کا تجسس اسے آگے پڑھنے پر مجبور کرے؟

☆☆ ہر کہانی کا اپنا ایک ہیتی یا تکنیکی ڈھانچہ ہوتا ہے جو ظاہری ڈھانچے کے اندر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کے یہ دونوں سوال اس افسانہ نگار سے متعلق ہیں جو

کہانی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک میکانیکی طریقے سے کہانی بناتا ہے۔ نئی کہانی اس طرح نہیں لکھی جاتی۔ میں واقعات کے ٹکڑے نہیں جوڑتا' مجھ پر پوری کہانی ایک اکائی کی صورت وارد ہوتی ہے' ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھتے ہوئے یا بعد میں ایک آدھ جگہ کوئی تبدیلی کر لی جائے۔ میں نے اپنی اکثر کہانیاں ایک نشست میں لکھی ہیں۔ اگر پورا خیال اپنے ابتدائی جملوں کے ساتھ مجھ پر وارد نہ ہو تو میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ پرانا افسانہ نگار واقعات کو جوڑ کر یا کسی کردار کو تلاش کر کے اس کے گرد کہانی بنتا تھا۔ میری اکثر کہانیوں کی بنیاد Idea ہے۔ پوری کہانی ایک خیال کے گرد بنی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ٹھوس واقعات کی بجائے بعض اوقات سیال صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ تو ہے کہ کہانی کا آغاز ہی ٹریپ کرنے والا ہوتا ہے۔ میری اکثر کہانیوں کے پہلے یا ابتدائی چند جملے ایسے ہیں کہ قاری حیرت اور تجسس کے ساتھ کہانی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔

☆ کہانی کی تخلیق کا سفر آپ اکیلے طے کرتے ہیں یا قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں یا قاری بہت بعد میں شامل ہوتا ہے؟

☆☆ زندگی کے معمولی واقعات میں سے غیر معمولی واقعات کا انتخاب کہانی کار کی باریک بینی اور زندگی کے گہرے مشاہدے کے ذریعے ہو سکتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی تب وجود میں آتی ہے جب اس واقعہ کا ذکر کیا جائے جو ابھی پیش آتا ہے۔

☆ آپ کا کیا خیال ہے' اچھی کہانی وہ ہے جو پڑھنے والے کو اچھی لگے' یا جو تخلیق کار کو پسند ہو؟

☆ کیا آپ کہانی شروع کرنے سے پہلے غور و فکر کرتے ہیں' کہانی کا موضوع اور خاکہ سوچتے ہیں اور کیا کہانی اس خاکے کے مطابق ہو جاتی ہے جو آپ نے سوچا ہے اور اسی طرح اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے یا لکھتے ہوئے اصل موضوع سے ہٹ جاتے ہیں؟

☆☆ ان تین سوالوں کو میں اکٹھا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میرے افسانے موضوعاتی نہیں ہیں۔ وہ تو کسی خیال یا Idea پر لکھے گئے ہیں۔ میرا

تخلیقی عمل یوں ہے کہ میرے ذہن میں ایک خیال آتا ہے یا کسی صورت حال کو دیکھ کر یا اس سے گزرتے ہوئے ایک Idea پیدا ہوتا ہے۔ اس پر میرے ذہن میں ایک تخلیقی پروسیس شروع ہو جاتا ہے بعض اوقات فوراً" اور بعض اوقات مہینوں یہ خیال اس تخلیقی پروسیس سے گزرتا رہتا ہے۔ میں لکھنے سے پہلے اس کی منطقی یا تکنیکی ترتیب قائم نہیں کرتا۔ یہ خیال اپنے ابتدائی جملوں کے ساتھ میرے ذہن کی سکرین پر واضح ہوتا ہے۔ اگر یہ ابتدائی جملے مناسب نہ ہوں تو میں اسے لکھ نہیں سکتا۔ اگر میں جملہ لکھتا ہوں یا دو ایک جملے لکھ کر انہیں بار بار کاٹوں تو مجھے خود اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کہانی ابھی اپنے تخلیقی پروسیس سے پوری طرح نہیں گزری۔ میں اسے اسی طرح چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن اگر میں نے اس کے ابتدائی چند جملے لکھ لئے اور وہ میرے خواہش کے مطابق ہوئے تو کہانی آگے چل پڑتی ہے۔ کہانی شروع کرتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا ایک دھندلا سا اختتام ہوتا ہے۔ بعض اوقات کہانی اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات آگے نکل جاتی ہے۔ اس اختتام کے بارے میں میری پلاننگ کم ہوتی ہے۔ بس مجھے کوئی چیز احساس کرا دیتی ہے کہ کہانی یہاں ختم ہونی چاہئے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کہانی مکمل ہونے کے بعد میں جب اسے دوبارہ پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی جہاں ختم کی گئی ہے اس سے کچھ پہلے مکمل ہو گئی ہے' چنانچہ میں بعد کا حصہ کاٹ دیتا ہوں یا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بات ابھی بنی نہیں سو دو چار جملے یا پیرا گراف اور لکھنا پڑتا ہے۔ یہ کام میرا تخلیقی سیلف نہیں بلکہ میرے اندر کا نقاد کرتا ہے۔ اب یہ بات شاید واضح ہو گئی ہے کہ میں کہانی لکھتے ہوئے کوئی خاکہ نہیں بناتا یا موضوع نہیں سوچتا نہ ہی اس کے آغاز' درمیان اور نقطہ عروج کی کوئی بات میرے ذہن میں ہوتی ہے۔ میری کہانی ایک مکمل اکائی کی شکل میں وارد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری اکثر کہانیوں میں پیچ ورک نہیں ہوتا۔ بہرحال ان کا ایک موضوع ضرور بنتا ہے ایک مرکزی خیال یا مرکزی رو بھی ہوتی ہے۔ میری اکثر کہانیوں کے موضوع ایسے ہیں جو ایک عام افسانہ نگار کے تخلیقی پروسیس کا حصہ نہیں بن سکتے اس لئے میرا تخلیقی عمل اور اس کا طریقہ کار قدرے مختلف ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ

مجھے ایک خیال سوجھتا ہے جو کہانی کی صورت اختیار کرتا ہے میں کسی واقعہ میں سے خیال نہیں نکالتا۔ میرے یہاں شعری وسائل کا زیادہ استعمال بھی اسی سبب سے ہے کہ میرے خیال اور موضوع عام یا سیدھے سادے طریقے کے متحمل نہیں۔ میرے اکثر افسانے (ابتدائی افسانوں کو چھوڑ کر) ایک چھوٹی سی بات سے شروع ہوتے ہیں اور ازلی و ابدی صداقتوں کو جا چھوتے ہیں۔ میرے افسانوں کا مرکزی کردار بیک وقت کئی زمانوں میں سانس لے رہا ہے اور وہ حال کے لمحہ پر کھڑا ایک ہی جست میں کبھی ماضی اور کبھی مستقبل میں اتر جاتا ہے۔ لیکن پڑھنے والے کو زمانی جھٹکا نہیں لگتا۔

☆ کہا جاتا ہے کہ موپساں نے یوں افسانے تخلیق کئے جیسے صفائی سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں۔ کیا آپ کا ایسے افسانے لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ یا آپ کے خیال میں زندگی یا حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسے اسی طرح پیش کر دینا افسانہ نگار کی سہل پسندی کو ظاہر کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کا اپنا کوئی نظریہ کوئی فلسفہ کسی مخصوص اسلوب میں ظاہر نہ ہو؟

☆ ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی فکشن میں دو سطحوں میں پیش ہوتی ہے۔ ایک Life in Time دوسرے Life in Values آپ کا نظریہ کیا ہے؟

☆☆ یہ دونوں سوال ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ نیا افسانہ حقیقت نگاری نہیں بلکہ وہ اس دھند میں سے نکلتا ہے جو ظاہری حقیقت کے پیچھے ہے۔ اس دھند اور اس میں چھپی پراسرار دنیا تو عام شخص نہیں دیکھ سکتا۔ اصل حقیقتیں یا سچائیاں اس سے مختلف ہیں جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ محض بیانیہ حقیقت نگاری یک سطحی ہوتی ہے۔ اب تو حقیقت نگاری کا رویہ بھی بدل گیا ہے اور وہ لوگ جو خود کو حقیقت نگار کہتے ہیں محض حقیقت بیان نہیں کرتے بلکہ اس سے کچھ آگے جاتے ہیں۔ صفائی سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ کر کہانی بنا لینا بڑا فن نہیں۔ ہمارا مشرقی مزاج تو جزو میں کل اور قطرے میں دریا دیکھنے کا ہے۔ انسان وقت اور اقدار دونوں ہی میں زندہ ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پرانے تنقیدی نظریے' کلیشے یا رویے نئی کہانی کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔ آج کی

کہانی سماجی سیاسی رویوں سے متعلق ہوتے ہوئے بھی بڑے ازلی و ابدی سوالات سے جڑی ہوتی ہے۔ ایک مکمل فن صرف ناف سے نیچے' یا شکم تک' یا دل تک محدود نہیں' اب اس میں ذہن بھی شامل ہے اور یہ کائنات کی تسخیر اور نت نئے انکشافات کا زمانہ ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کے یہاں وقت' اقدار' سماج' سیاست حقیقت اور دھند' تجسیم و تجرید سب کچھ موجود ہوتا ہے' کبھی ملی جلی صورت میں' کبھی انفرادی عکس کی شکل میں۔

☆ بانجھ لمحہ میں مہکتی لذت' بند ہوتی آنکھ میں ڈوبتے سورج کا عکس' گم راستوں میں کشف' فاصلے سے بچھڑا غم' منجمد موسم میں ایک کرن' بے راستوں کا ذائقہ' بے ثمر عذاب' بے دروازہ سراب' دھند منظر میں رقص' کھلی آنکھ میں دھند ہوتی تصویر---- یہ عنوانات صرف "پت جھڑ میں خود کلامی" سے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ تمام عنوانات موجود کو غیر موجود' معنویت کو بے معنویت' روشنی کو دھند اور اثبات کو نفی میں تبدیل کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ روش انسان کی بے چارگی اور مجبوری کی دلیل نہیں اور اسے مایوسی کی طرف نہیں لے جاتی؟

☆☆ ہمارا یہ موجود اصل حقیقت کا پرتو ہے۔ اعیان نامشہود تک ہماری رسائی براہ راست ممکن نہیں۔ ہم جسے معنویت سمجھتے ہیں وہ دراصل بے معنویت ہے چنانچہ حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہم کو ایک بار موجود سے ناموجود کی طرف جانا پڑتا ہے۔ روشنی سے دھند اور اثبات سے نفی کا یہ سفر بہت اہم ہے' اس لئے کہ ایک بار نفی کرنے کے بعد ہی اثبات کا اثبات ہوگا اور بے معنویت کے نقطے سے معنویت کا اشارہ ملے گا۔ صوفیاء اپنی نفی کے بعد اثبات کا سفر شروع کرتے تھے۔ موجود صورت میں حقیقت اور معنویت دونوں ہی اضافی چیزیں ہیں۔ کلی حقیقت اور کلی معنویت کا کوئی کلی تصور موجود نہیں۔ موجود سے ناموجود کی طرف جانا اور پھر اس نقطہ سے دوبارہ موجود کی طرف لوٹنا ایک کشفی عمل ہے۔ یہ سارے عنوانات اسی کشفی عمل اور مابعدالطبیاتی پروسیس کی علامتی صورتیں ہیں اور اپنی اپنی کہانی کی مرکزی واردات کی نوعیت کا انکشاف کرتے ہیں۔ میری کہانیاں صرف زمینی وارداتوں یا حکایات تک محدود نہیں' ان میں اٹھائے گئے سوال بڑے ہیں اور انسان

و کائنات کی ازلی و ابدی حقیقتوں اور وارداتوں سے منسلک ہیں۔ اس لئے عنوانات بھی انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ میری کہانیوں میں شناخت اور تشخص کا عمل فرد سے شروع ہو کر اجتماع اور اجتماع سے پھر فرد اور فرد کے حوالے سے کائناتی ہو جاتا ہے۔ انسانی المیہ کئی سطحوں پر موجود ہے۔ طبقاتی معاشرے میں یہ بے چارگی ایک معنی رکھتی ہے۔ پورے گلوب پر اس کے معنی دوسرے ہیں۔ خالصتاً" فرد کی سطح پر اس کا احساس اور اظہار دوسرا ہے اور انسان کی تخلیق اور لمحہ ازل میں کُل سے اس کی جدائی اور کائنات کے وسیع تر تصور میں اس کی بے چارگی اور تنہائی ایک بالکل ہی الگ چیز ہے۔ یہی صورت تنہائی کی بھی ہے۔ تنہائی کو ہمارے ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن تنہائی کی کئی سطحیں ہیں۔ فرد کی انفرادی تنہائی' مجمع میں تنہائی اور روحانی و ازلی تنہائی۔ پھر اس کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ انفرادی بے چارگی' طبقاتی و معاشی جبر' سماجی و سیاسی جبر اور ان سب سے مختلف ازلی و ابدی روحانی تنہائی' ان سب کی کیفیت اور اسباب مختلف ہیں' لیکن ان میں ایک ارتقائی سفر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے' میرے فنی سفر میں شاید یہ ارتقاء موجود ہے' چنانچہ یہ روش انسان کی بے چارگی اور مجبوری نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش اور اس کو پانے جاننے کی معنویت سے عبارت ہے۔

☆ قبر' موت' جنازہ آپ کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ کبھی شہر میں جنازہ گم ہو جاتا ہے اور قبر لاش مانگتی ہے۔ کبھی بیوی کو بار بار یقین دلایا جا رہا ہے کہ میں مرچکا ہوں۔ کبھی گھر قبر اور قبر گھر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کبھی ماں کے مرنے کی دعا ہے۔ کبھی زہر پینے کے بعد موت کا انتظار تو کبھی اپنی قبر کھدنے کا انتظار۔ کیا موت آپ کے نزدیک ذریعہ نجات ہے؟

☆☆ قبر' موت اور جنازہ مختلف ادوار میں مختلف معنویت کی علامت ہے۔ "بے زار آدم کے بیٹے" کی کہانیوں میں قبر اور موت خارج میں موجود ناموافق صورتحال سے پناہ کی جگہ ہیں۔ یہاں آکر ایک سکون ملتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے دشمن فضا سے جان چھوٹ جاتی ہے۔ یہ فرار انفرادی نوعیت کا ہے اور حقیقت سے آنکھ چرانے کے رویہ سے عبارت ہے۔ یہاں فرد طبقاتی جبر اور معاشی ناہمواری کے بوجھ تلے دبا

ہوا ہے اور کسی حد تک، کچھ نہ کر سکنے کے رویے نے اس کے اندر ایک غصہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ غصیلا جوان اشیاء اور قدروں کو توڑنا پھوڑنا چاہتا ہے۔ ان کے ہونے کا انکار کرتا ہے اور جب رد عمل شدید ہوتا ہے تو قبر اور موت اس کی پناہ گاہیں بنتی ہیں۔ یہاں کی دھند اور تاریکی میں اس کی شناخت اور پہچان ہوتی ہے۔ لیکن جب مارشل لاء کے جبر و تشدد میں شناخت اور پہچان مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اسے تلاش کیا جاتا ہے تو قبر، موت اور جنازہ سیاسی علامتیں بن جاتے ہیں ("سہ پہر کی خزاں" کے افسانوں میں) لیکن جب شناخت اور پہچان کا یہ سفر روحانی ہو جاتا ہے اور مابعد الطبیعاتی سچائیوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو قبر اور موت کی علامتیں اپنے معنی بدل لیتی ہیں ("بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" کے افسانوں میں)۔ یوں ان علامتوں میں ایک معنوی اور فکری ارتقاء بھی پیدا ہوا ہے جو میرے بنیادی موضوع شناخت اور پہچان کے تصور کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

☆ آپ کے افسانوی مجموعوں "کاغذ کی فصیل"، "بے زار آدم کے بیٹے" "پت جھڑ میں خود کلامی" اور دشت خواب" ان سب میں اسلوبی سطح پر فرق واضح ہے۔ اس میں قاری کی خواہش کا احترام شامل ہے یا پھر یہ تبدیلی غیر شعوری طور پر بدلتے ماہ و سال کے ساتھ ہوئی ہے؟

☆☆ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بے زار آدم کے بیٹے" (۱۹۷۴ء) ہے لیکن ترتیب کے اعتبار سے پہلا مجموعہ "کاغذ کی فصیل" ہے جو بہت بعد میں (۱۹۹۳ء) میں چھپا۔ "کاغذ کی فصیل" سے "دشت خواب" تک اور اب تازہ افسانوں میں میرے اسلوب میں ایک تبدیلی آئی ہے، لیکن اس کی وجہ کسی کی خواہش کا احترام نہیں بلکہ اس کا تقاضا یا ضرورت میرے تخلیقی عمل کے باطن سے پیدا ہوئی ہے۔ میرے ابتدائی افسانے زیادہ تر جنسی حقیقت نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ کہانی کی بنت اور موضوع کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں اسی بیانیہ انداز میں لکھا جائے۔ لیکن یہ بیانیہ بھی بالکل سادہ نہیں بلکہ میرے بعد کے اسلوب کے اشارے اس میں موجود ہیں اور اس سادہ بیانیہ میں بھی استعارہ اور تشبیہ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ "بے زار آدم کے بیٹے" میں ایک غصیلا نوجوان، طبقاتی اور معاشی جبر میں اپنی شناخت تلاش

کر رہا ہے۔ یہ شناخت ذاتی ہے اور یہاں علامتیں بھی کہیں کہیں پرسنل ہو جاتی ہیں لیکن مجموعی فضا میں ان کے معنی موجود ہیں۔ اسلوب میں استعارہ سازی کا عمل پیکر تراشی سے مل کر ایک نیا انداز پیدا کر رہا ہے۔ "ریت پر گرفت" کے افسانوں میں تجریدیت زیادہ ہے اس لئے اسلوب میں دبازت' شعری وسائل کا استعمال' شعریت اور پیکر تراشی میں باطنی گہرائی نمایاں ہے۔ موضوع کی گنجلک اور دبازت کی وجہ سے اسلوب میں بھی ادقیت ہے۔ اس مجموعہ میں کسی حد تک ترسیل کا مسئلہ بھی موجود ہے۔ یہ افسانے ذہین قاری کا تقاضا کرتے ہیں' لیکن اسی مجموعہ کا آخری افسانہ "ڈوبتی پہچان" ایک نئے ذائقے اور مزاج کی نشاندہی کرتا ہے اور یہاں سے اسلوب کی ایک نئی پرت شروع ہوتی ہے جس میں جملہ بظاہر سادہ ہے لیکن علامتی دبازت اور معنویت گہری ہے۔ "سہ پہر کی خزاں" کی کہانیاں مارشل لائی جبر اور تشدد میں گھرے شخص کی کہانیاں ہیں جو اس جبر میں اپنی شناخت تلاش کر رہا ہے ان افسانوں کا اسلوب اپنی ایک الگ علامتی معنویت لئے ہوئے ہے۔ یہاں قبر' موت اور جنازہ اور کہیں قبرستان اور گٹر سیانی فضا میں سی چنی گئی علامتیں ہیں۔ "پت جھڑ میں خود کلامی" کی کہانیوں میں شناخت کا عمل ایک وسیع تر سماجی پروسیس میں شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلوب میں بھی ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" کی شناخت کائنات کے وسیع تر تناظر میں ایک کشفی روحانی عمل کا حصہ ہے' چنانچہ اسلوب میں ایک نئی طرح کی دبازت اور معنویت آ جاتی ہے۔ علامتیں آفاقی ہو جاتی ہیں اور ایک نیا کردار مرشد اپنی پہچان کراتا ہے۔ مرشد کے کردار کی ابتدائی جھلکیاں میرے شروع کے افسانوں میں بھی کہیں کہیں موجود ہیں لیکن اس کی واضح صورت اس مجموعے میں سامنے آئی ہے۔ اسلوب کی ساری صورتیں میرے مجموعی اسلوب کی مختلف پرتیں ہیں اور یہ میرے بنیادی موضوع شناخت اور پہچان کے ارتقائی تصور سے جڑی ہوئی ہیں۔

☆ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے آپ کے نزدیک ماضی اہم ہے' حال یا مستقبل۔ آپ کا تصور وقت کیا ہے؟

☆☆ میرے یہاں وقت کا تصور ماضی' حال یا مستقبل کے کسی ایک نقطے تک

محدود نہیں۔ میں ماضی کو حال کے لمحہ موجود سے ملا کر مستقبل کی طرف سفر کرتے ہوئے وقت کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ "دریا" میرے یہاں ایک خاص استعارہ ہے جو بہتے ہوئے وقت کی تصویر بناتا ہے۔ اس میں ماضی و حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس وقت کا تصور زمانی تقسیم کے بغیر ہے۔ ماضی حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اصل اہمیت وہ جست ہے جو لمحہ موجود کو پھیلا کر وقت کا تسلسل بنا دیتی ہے۔ وہ تسلسل جو وقت کو زمانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ میرے افسانے "لمحہ جو صدیاں ہوا" (بھاگے ہے بیاباں مجھ سے) کا کردار یوں کہتا ہے۔

"شیخ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز پراسرار تبسم ابھرا' بولے "وقت ایک دریا کی مانند ہے جس کی لہروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا' اگرچہ دیکھنے میں وہ الگ الگ نظر آتی ہیں۔ ماضی کی گود سے حال' حال کی گود سے مستقبل اور مستقبل کی گود سے پھر ماضی طلوع ہوتا ہے۔ ایک دائرہ جس کا ایک مرکز ہے اور اس مرکزہ کی کوئی زبان نہیں نہ کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔"

ایک ہی لمحہ میں کئی جہانوں میں رہنے کی اذیت و لذت میرے تصور وقت کا ایک اہم پہلو ہے۔ ایک ہی لمحہ میں بیک وقت کئی حقیقتوں کی آگاہی کے کے نتیجے میں میرے تخلیقی عمل میں تہہ داری پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے میرے اظہار میں بھی تہہ داری آئی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی نے اپنے ایک مضمون میں میرے بارے میں لکھا ہے کہ "تہہ دار شعور تضادات اور تقابل کے علاوہ بے یقینی کی صورت میں بھی ظاہر ہوا ہے۔ یہ بے یقینی عمل اور بے عملی کے درمیان لٹکتے رہنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ بیک وقت دو انتہاؤں کی کھینچا تانی بھی تہہ دار شعور کو جنم دیتی ہے۔" لمحہ موجود میں مختلف طرح کے احساسات اور کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش نے وقت کو ایک گزراں لمحہ بنا دیا ہے یوں وقت زمانے کی قید سے آزاد ہو کر صرف وقت رہ جاتا ہے۔ یہ مختلف احساسات کی درمیانی حدوں کو توڑنے' ان میں یکجائی پیدا کرنے اور لمحہ میں ابدیت کا عکس دیکھنے' زمانے کی قید سے آزاد وقت میں زندہ رہنے اور مختلف زمانوں کے واقعات و تجربات کو بیک وقت سوچنے' محسوس کرنے اور اپنے آپ پر طاری کر کے ایک نئی فضا پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ چنانچہ

میرے پاس وقت کا تصور کسی زمانی قید تک محدود نہیں بلکہ ایک ہی لمحہ میں کئی لمحوں کی بازیافت ہے جہاں وقت زمانے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔

☆ ٹوٹی ہوئی دیوار (کاغذ کی فصیل) یہ کہانی تیس سال پہلے کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ آج ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہانی کسی دیہاتی سکول کا منظر ہی پیش نہیں کرتی بلکہ مہذب شہر کے مہنگے سکول کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے۔ بحیثیت استاد آپ نظام تعلیم کو کہاں تک درست سمجھتے ہیں' کیا تجاویز پیش کرتے ہیں؟

☆☆ یہ کہانی (ٹوٹی ہوئی دیوار) تیس سال پہلے لکھی گئی تھی' آج بھی صورتحال یہی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کا زوال تو بہت پرانا ہے۔ بلکہ اس کا آغاز تو برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے مدرسے کسی بھی طرح کی سیاسی اور حکومتی مداخلت سے آزاد تھے۔ بادشاہ مدرسہ کو ایک بار جو جاگیر دے دیتا تھا' بعد والوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ اسے واپس لے لیں۔ ہمارے ان مدرسوں میں دین کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے علوم پر بھی توجہ دی جاتی تھی چنانچہ حدیث' فقہ اور تفسیر کے ساتھ ساتھ منطق' حساب اور فلسفہ بھی نصاب میں شامل تھا۔ انگریزوں نے اس نظام پر ضرب لگائی۔ جاگیریں چھین لیں اور مدرسوں کو زکوۃ اور چندے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا انگریزی ٹائپ کے مدرسے قائم ہوئے جن میں سے دین تقریباً" خارج ہو گیا۔ ان مدرسوں کا مقصد انگریز حکومت کے لئے وفادار سرکاری ملازم پیدا کرنا تھا۔ مولانا شبلی نے علی گڑھ کے بارے میں کہا تھا "یہ ہر میجسٹی کے لئے وفادار ملازم پیدا کرنے کی فیکٹری ہے۔" اکبر الہ آبادی کو بھی یہی اختلاف تھا کہ مسلمانوں کو ہنر اور مختلف پیشے سکھانے کی بجائے ان تعلیمی اداروں کے ذریعے سرکاری وفادار ملازم بنایا جا رہا ہے۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کا اولین مقصد آئی سی ایس کرنا ہوتا تھا اور یہ نہ ہو سکے تو پھر کلرک بن جانا۔ یہ رویہ اور مقصد آج بھی موجود ہے۔ ہماری تعلیم کا مقصد صرف نوکری حاصل کرنا ہے اور سرکار کی اطاعت کرنا۔ میکالے نے جو تعلیم پالیسی، بنائی تھی اسے جب منظوری کے لئے وائسرائے کے پاس بھیجا تو اس پر جو نوٹ لکھا وہ قابل غور ہے۔ اس نے لکھا "ہم چند ہزار انگریز کروڑوں کی آبادی کے اس ملک پر اس وقت تک

دیر تک حکومت نہیں کر سکتے' جب تک یہاں ایک ایسی جماعت وجود میں نہ آ جائے جو نسلاً" ہندوستانی ہو اور ذہنی طور پر انگریز' مجھے یقین ہے کہ اس تعلیمی پالیسی پر عمل کر کے چند ہی برسوں میں ایسی جماعت وجود میں آ جائے گی۔" یہ تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے کہ چند ہزار انگریز (جن کی تعداد پچیس تیس ہزار سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی اور کسی وقت تو یہ دس ہزار سے بھی کم رہی) کروڑوں کی آبادی کے اس ملک پر نوے سال حکومت کر گئے اور اس دوران کوئی بڑا واقعہ یا ہنگامہ بھی نہیں ہوا۔ ایک شہر میں انگریز حاکم چار پانچ ہی ہوتے تھے۔ ایک کمشنر' ایک ڈپٹی کمشنر' ایک ایس پی اور ایک افسر مال اور ایک دو اور۔ باقی سارا انتظام یہی نسلاً" ہندوستانی ذہنی انگریزی کرتے تھے۔ یہی وہ جماعت تھی جسے میکالے کے نظام تعلیم نے جنم دیا۔ یہی نظام تعلیم تقریباً" اسی صورت میں آج بھی رائج ہے اور ہمارے حاکم عوام کو محکوم سمجھتے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم قومی مقاصد سے ہم آہنگ نہیں۔ ہم طالب علم کی ذہانت کا نہیں یادداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ ہمارا معیار نمبر ہیں۔ ہم پروفیشنل کالجوں یا دوسرے اداروں میں داخلے کے لئے نمبروں کو معیار سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقررہ نمبروں سے ایک نمبر کم والا نااہل ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جہاں داخلہ ٹیسٹ اور امتحان کا نظام ہے وہ بھی ہماری روایتی بددیانتی کی وجہ سے ناکام ہو گیا ہے۔ سیاسی مقاصد اور شہرت کے لئے غیر ضروری نصابی بوجھ بڑھایا گیا ہے۔ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو انگریزی اور اردو زبان کے نصاب میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض زبانوں کی غیر ضروری لازمی تعلیم بھی ایک بوجھ ہے۔ انگریزوں نے دینی مدارس اور دنیاوی مدارس کو الگ الگ کر کے مسلمان معاشرے میں جس تقسیم کا بیج بویا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔ ادھر سے دنیا نکل گئی' ادھر سے دین نکل گیا۔ وہ ایک انتہا اور یہ دوسری انتہا ہو گئی۔ دین و دنیا کے اسی جھگڑے نے ہماری مجموعی دانش' رواداری اور قومی مزاج کو متاثر کیا۔ اب تک ہماری جتنی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں۔ وہ میکالے کے نظام تعلیم کے اصولوں پر ہی قائم ہیں۔ بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی صرف انتظامی تبدیلیوں کے پیچھے سیاسی مقاصد اور کچھ لوگوں کو ملازمتیں دینا اور ان کے لئے نئے محکمے کھولنا رہا ہے۔ اگر ہم

سنجیدگی سے اپنے تعلیمی نظام کی اصلاح چاہتے ہیں تو سیاسی وابستگیوں اور مفاد سے بالا ہو کر اس پر غور کرنا چاہئے۔ لیکن شاید یہ ممکن نہیں کہ ہم جس مجموعی زوال کے عمل سے گزر رہے ہیں اس میں صورت حال یہی رہے گی۔ جب کوئی قوم اپنے زوال پر فخر کرنے لگے اور زوال سے لطف اٹھانا شروع کر دے تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔

☆ آج قاری کی جگہ ناظر نے لے لی ہے۔ کیا یہ صورت حال ادب کے لئے نقصان دہ نہیں؟

☆☆ یہ تبدیلی تو دنیا بھر میں ہو رہی ہے۔ لیکن اس سے خوف زدہ ہونے کی بجائے خود کو اس کے مطابق تیار کرنا چاہئے۔ اب تو انٹرنیٹ پر بھی ادب فیڈ ہو رہا ہے۔ بنیادی بات تو اظہار اور قاری یا ناظر تک پہنچنے کی ہے۔ اگر یہ کام کتاب کی بجائے سکرین یا کمپیوٹر کا نیٹ ورک کر رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم زمانے کو تو واپس نہیں لے جا سکتے' خود کو اس کے مطابق تیار کر سکتے ہیں اور یہی ہمیں کرنا چاہئے۔

رشید امجد آج بھی نئے تکنیکی تجربوں اور نئے بیانیہ طریق کار کے ساتھ تازہ دمی سے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ۶۰ سے ۷۰ کے درمیان لکھنا شروع کیا۔ "بے زار آدم کے بیٹے" اور "ریت پر گرفت" ان کے اولین دور کی کہانیاں ہیں۔ انہوں نے جدیدیت کے زیر اثر تنہائی، 'میں' کی داخلیت، ذات کی شکستگی، گھٹن اور انتشار کو محور بناتے ہوئے شعری بیانیہ اور نثری ساخت کے تجربے کئے۔ ان کی منفرد شناخت کھلتے ہوئے اسلوب اور تازگی بیان کے ساتھ فنی ندرت سے ہوئی۔ انہوں نے افسانوی تخلیق کو مکالموں، استغراق کے عمل اور خوابناک سوچ کے ساتھ داخلی خود کلامی، Empathy اور ساختیاتی کرافٹ سے معمور کیا۔ ان کے یہاں شہر کی گھٹن ہے مگر دلچسپ بیان کے ساتھ، آدمی موت کے کنارے کھڑا ہے مگر اسکا احساس ایک میلہ بن جاتا ہے۔ ان کی افسانوی ہیت میں گھل جانے والی لذت ہوتی ہے۔ انور سجاد کے برخلاف وہ کرداروں کو علامتی رنگ نہیں دیتے بلکہ ماحول اور صورت حال علامتی ہوتی ہے کردار یا دیگر اشیاء اس علامت کے جزو ہوتے ہیں جنہیں کبھی حقیقی اور کبھی استعاراتی شکل دی جاتی ہے۔ رشید امجد کا اپروچ Satirical ہے۔ کہانی بننے کا اپنا مخصوص ہنر ہے۔ "ریت پر گرفت" کے علاوہ "گملے میں اگا ہوا شہر"، "میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا"، "بانجھ لمحے میں مہکتی لذت" ساختیاتی بنت کے نمائندہ افسانے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ "ڈوبتی پہچان" ان کی تخلیقی روش کی عکاسی کرتا ہے۔ اپنے حالیہ افسانے "دھند" میں رشید امجد فضاء کو علامت بناتے ہوئے سیدھے سادے بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں۔

مہدی جعفر

حرف اکادمی
103A-1 پشاور روڈ راولپنڈی
فون:5566131